The Ven'ble Archdeacon BARAKAT ULLAH, M.A.F.R.A.S

THE TEACHINGS OF JESUS
IN THE SYNOPTIC GOSPELS

By
The Ven'ble Archdeacon BARAKAT ULLAH,
M.A.F.R.A.S

مصنفہ
قسیس معظم آرچ ڈیکن برکت اللہ۔ ایم۔ اے
ایف۔ آر۔ اے۔ ایس

1952

www.muhammadanism.org
Urdu
Sept.08.2004

فہرست مضامین

"ضرور ہے ہم ایک ایسے شخص کا انتظار کریں جو اس کی طرف سے آئے جو ہماری پرواہ کرتا ہے تا کہ وہ آکر ہم کو یہ بتائے کہ خدا اور انسان کے ساتھ ہم کیا رویہ اختیار کریں"۔

(سقراط)

"ہم ان باتوں کی نسبت کچھ علم نہیں رکھ سکتے جب تک کوئی شخص عالم بالا سے آکر ہم کو نہ بتلائے"۔

(سقراط)

"ہم یہ نہیں جان سکتے کہ ہم خدا سے کیا عرض ومعرض کریں اور اس کی عبادت کس طرح لائق طور پر کریں۔ پس لازم ہے کہ ان امور کی تعلیم دینے کے لئے آسمان سے ایک مقنن آئے۔ ایسے شخص کو دیکھنے کو میرا جی تڑپتا ہے۔ اس مقنن کو ایک فوق البشر شخص ہونا چاہیے تا کہ وہ ہم انسانوں کو ان باتوں کی تعلیم دے سے جو انسانی فطرت سے بعید ہے"۔

(افلاطون)

مُقَدّمَہ

دنیا میں غالباً اس سے زیادہ محیر العقول کوئی امر نہیں ہوگا کہ علم وتہذیب سے دُور افتادہ ملک کنعان (موجودہ فلسطین) کے ایک جاہل اور حقیر صوبہ گلیل کے ایک معمولی غریب گھرانے میں ایک ایسی شخصیت پیدا ہوئی جس کی تعلیم اور شخصیت نے دنیا کی کایا پلٹ دی۔ انہوں نے غالباً صرف تین سال تک گلیل کے مچھوؤں اور دہقانوں میں توبہ اور خدا کی محبت اور بادشاہت کی منادی۔ لیکن یہ تعلیم اس قدر دل پذیر اور موثر ثابت ہوئی کہ چند سالوں کے اندر اس کی گونج ہم کو اقصائے عالم تک سنائی دیتی ہے۔ چار صدیوں کے اندر اندر اس نے شاہ وگدا، عالم وجاہل ،آقا اور غلام کو اپنا گرویدہ اور شیدائی بنالیا۔اس نے دوہزارسال کے عرصہ میں دنیا کے تمام ممالک میں کروڑوں انسانوں کا میل اپنے خالق سے کرادیا اور ایسی مقدس اور برگزیدہ ہستیاں پیدا کردیں جو زمین کا نمک تھیں۔قیاصرہ نے جورو ظلم ،عقوبت وتعذیب کے ذریعہ اُن کی تعلیم کومٹانا چاہا لیکن وہ خود مٹ گئے ۔ دنیا کے سرداروں اور سلطانوں نے اُس کے خلاف پرے باندھے لیکن وہ مغلوب نہ ہوئی۔ ہر دشمن دم واپسین حسرت کے ساتھ یہی کہتا مر گیا ۔"اے گلیلی تو فاتح رہا "جہاں کہیں یہ تعلیم دی گئی اس کے آفتابی نور نے ظلمت کومٹادیا۔ جو شخص **"دنیا کے نور"** کا پیرو ہو گیا اس سے تاریکی کوسوں دُور بھا گی۔ بطالت اور جہالت کا قلع قمع ہو گیا

(۱) منجئی عالمین کی تعلیم کی تاریخی صحت

اس مختصر رسالہ میں ہم کلمۃ اللہ کی تعلیم پر غور کریں گے ۔ لیکن اس سے پہلے یہ ضرور ہے کہ ہم اس تعلیم کی صحت اور اس کا پایہ اعتبار معلوم کریں۔ پس ہم ابتدا میں ان سوالوں پر غور کریں گے کہ سیدنا مسیح کی تعلیم کے ماخذ کیاہیں اوران ماخذوں کا تاریخی پایہ کیاہے۔ ان سوالوں کا تسلی بخش جواب نہایت ضروری ہے کیونکہ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ جو الفاظ انجیل جلیل میں مندرج ہیں وہ سیدنا مسیح کی زبانِ معجز بیان سے نکلے ہیں توہمارے اذہان متاثر ہوسکتے ہیں اورہماری قوت متخیلہ ایک معلوم شے کے ذریعے اثر کرکے اورہمارے جذبات کو مشتعل کرکے ہمیں راہ ہدایت پر لاسکتی ہے ۔ علاوہ ازیں ہم صرف اس صورت میں خدا کی مرضی کو جان سکتے ہیں ۔ اورانجیلی بیان کو خدا کی محبت کا مکاشفہ مان سکتے ہیں جب ہم کو اس امر کا پختہ یقین ہوجائے کہ کلمۃ کے اقوال صحیح تاریخ کے اصول پر پورے اترتے ہیں ۔

بعض اصحاب کو یہ اندیشہ لاحق ہے کہ اگر انجیل جلیل کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے گا توہمارا ایمان متزلزل ہوجائے گا ۔ لیکن یہ خیال باطل اوربے بنیاد ہے۔ سیدنا مسیح نے خود فرمایا ہے کہ " تم کتاب مقدس کوڈھونڈو"(یوحنا ۵: ۳۹)حاشیہ اور مقدس پطرس کہتا ہے کہ " جو کوئی تم سے تمہاری امید کی وجہ دریافت کرے اس کے جواب دینے کے لئے ہر وقت مستعد رہو"۔(۱ پطرس ۳: ۱۵) منجئی جہان خود راہ حق اور زندگی ہے پس حق کی

اور حق کی روشنی ہر جانب پھیل گئی۔تاریخ سکندریہ کے ایک عالم کے الفاظ کی صداقت کی گواہ ہے کہ" **ہمارے استاد سیدنا عیسیٰ مسیح کلمتہ اللہ تمام بنی نوع انسان کے ہادی اور رہنما ہیں۔"**

دور کیوں جاؤ اپنے ملک کو دیکھ لو۔ چہار سو مذاہب کی اصلاح ہورہی ہے یہ کیوں؟ اس لئے کہ کلمۃ اللہ کی روشنی نے ظلمت کدہ ہندوپاکستان کو بقعہ نور بنادیا ہے غیر مسیحی اپنے باطل عقائد کو اس نور کی روشنی میں ترک کررہے ہیں اور اپنے مذہب کی کتر چھانٹ کرکے تاویلات اور اصلاح کررہے ہیں ۔ تاکہ کسی نہ کسی طرح ان کی کتب کلمۃ اللہ کی تعلیم کی روشنی کے مقابل قائم رہ سکیں۔ ہندومت کی طرف نظر کرو۔ تو پچاس برس پہلے کے عقائد کی وقعت اب فضول قصص سے زیادہ نہیں رہی۔ خود ہندو اس کے سوشل اورمذہبی قوانین سے علانیہ روگردانی کرکے برسر عام کہتے ہیں کہ شاستروں کے عقائد اس زمانہ کے لئے موزوں نہیں رہے ۔ جن عقائد پر پچاس سال قبل اسلام فخر کیا کرتا تھا وہ اب اپنا منہ چھپارہے ہیں ۔ اب جہاد کی تعلیم ، تعداد ازدواج، نعمائے بہشت وغیرہ کی پاور ہوا تاویلات کی جاتی ہیں تاکہ اسلام پر سے تاریکی کا داغ دور ہوسکے ۔ خود قرآن کہتاہے کہ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (سورہ بنی اسرائیل ۸۱) یعنی حق آگیا اور باطل دور ہوگیاہے اور باطل نیست ہوجانے والی شے ہے۔

جستجو میں ہم سیدنا مسیح اوراس کی خوشخبری سے دُور بھٹک نہیں سکتے ۔ **تنقید اور عقل حق کی دشمن نہیں بلکہ حق کی غلام ہیں۔**

گذشتہ ڈیڑھ سوسال سے اہل مغرب انجیل جلیل کی صحت کی جانچ پڑتال کررہے ہیں ۔ ہم یہاں نہایت مختصر طورپر ان کی مساعی کے صرف ان مسلم نتائج کا بیان کرسکتے ہیں ۔جو سیدنا مسیح کی تعلیم کےماخذوں اورانکی تاریخی صحت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

دور حاضرہ کی تحقیقات کا ایک نہایت ضروری اور اہم فائدہ یہ ہوا ہے کہ ہم کلیسیا کے علماء کے خیالات اور تاویلات اورانجیل شریف کی تعلیم میں تمیز کرسکتے ہیں زمانہ ماضی کے مصنفین یہ بات لازمی خیال تھے کہ کلمۃ اللہ کے انجیلی الفاظ کوکماحقہ سمجھنے کے لئے ان کو کلیسیائی تعلیم وعقائد کے مطابق ایک نظام میں منظم ومنسلک کیا جائے لیکن اب دورِ حاضرہ میں کلمۃ اللہ کے کلمات طیبات کو مقدم خیال کیا جاتاہے اورآپ کے زرین اقوال سے ہی آپ کی تعلیم مستنبط کی جاتی ہے اس زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے عظیم الشان فرق پیدا ہوگیاہے منجئ عالمین کے مبارک الفاظ انسانی ڈھانچوں میں ڈھالے نہیں جاتے۔ بلکہ وہ اپنی پہلی سی قدرت کے ساتھ ہم سے اب بھی کلام کرتے ہیں اوراب بھی ویسے ہی اثر ریز ہیں جیسے وہ شروع میں تھے۔

(۱) کلمتہ اللہ کی تعلیم کے ماخذ:

سیدنا مسیح کی تعلیم اناجیل اربعہ میں محفوظ ہے۔ اب اگرہم پہلی اور تیسری انجیلوں کولیں اورکالی سیاہی سے ان تمام مقامات اور فقرات کو تحت الحظ کریں۔ جو پہلی تینوں انجیلوں میں یکساں ہیں۔ توہم ذیل کے حیرت انگیز نتائج پر پہنچتے ہیں:

(۱-) انجیل دوم کا دوتہائی حصہ انجیل اول وسوم میں موجود ہے اورباقی ایک تہائی حصہ سوائے تیس آیات کے انجیل اول میں یا انجیل سوم میں موجود ہے[1]۔

(۲-) انجیل اول کی تین چوتھائی سے زیادہ حصہ (١٠٦٨ آیات میں سے ٨١٦ آیات) اورانجیل دوم کی دوتہائی سے زیادہ صفحہ (١١٤٩ آیات میں سے ٧٩٨ آیات) ان آیات کاہے جوانجیل دوم سے نقل کی گئی ہیں[2]۔

(۳-) اگرہم پہلی اور تیسری انجیلوں کے باقی ماندہ مقامات اور فقرات کوجوان دونوں انجیلوں میں یکساں ہیں لال سیاہی سے تحت الحظ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ایسی آیات(جن کی تعداد ٢٣٦ ہے) ان دونوں انجیلوں کا ایک بڑاجزو ہیں اور یہ آیات تقریباً تمام کی تمام تعلیم پر مشتمل ہیں۔

---

[1] Streeter,Synoptic Problem, in Peak's Commentary.p.673
[2] Sir.J.C.Hawkins in Synoptics Problem,edited by Dr.Sanday.p.29

مندرجہ بالا حقیقتوں سے تین اہم نتیجے اخذ ہوتے ہیں جو علما[3] کے نزدیک مسلم ہیں۔

اول۔پہلی اور تیسری انجیل کے لکھنے والوں نے مرقس کی انجیل کو نقل کیاہے۔

دوم۔ پہلی اور تیسری انجیل کے لکھنے والوں کے سامنے انجیل مرقس کے علاوہ ایک اور رسالہ تھا جو انہوں نے نقل کیاہے ۔ اور جو تقریباً سب کا سب تعلیم پر مشتمل تھا لیکن جواب ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ اس رسالے کو عموماً انگریزي حرف Q سے موسوم کیا جاتاہے۔ہم اس کو حرف تہجی "ک" سے جو لفظ کلمات کا پہلا حرف ہے موسوم کرینگے۔

سوم۔ انجیل اول کے مصنف نے انجیل سوم سے نقل نہیں کیا اور نہ انجیل سوم کے مصنف نے انجیل اول سے نقل کیا ہے یہ دونوں اناجیل مختلف اوقات اور مختلف جگہوں میں لکھی گئیں۔

(۲۔)ماخذوں کی تاریخی صحت:

اب ہم ان ماخذوں پر یکے بعد دیگرے محققانہ نظر ڈالیں گے تاکہ معلوم ہوسکے کہ وہ پایہ اعتبار سے ساقط ہیں یا نہیں۔

[3] Stanton, The Gospels as Historical Documents.Pt.2 Chap.I.pp.1-60

اول۔ مقدس مرقس کی انجیل ۔ یہ انجیل مقدس یوحنا مرقس نے لکھی ہے ۔ وہ غالباً خود منجئی عالمین کے شاگردوں میں سے نہیں تھے لیکن پہلے مقدس پولوس کے اور پھر مقدس پطرس کے ساتھی تھے۔ پس ان کے پاس سیدنا مسیح کے سوانح حیات اور اقوال کو معلوم کرنے کے لئے بہترین ذرائع تھے۔ چنانچہ بزرگ پےپئس (Papias) تاریخ پیدائش ۶۰ء کہتاہے " مقدس مرقس پطرس کا مترجم تھا اور اس نے مسیح کے اقوال اور افعال کو جو پطرس کو یاد تھے نہایت صحت کےساتھ ترتیب وار تحریر کیا۔ مرقس نے لکھنے میں کوئی غلطی نہ کی۔ بلکہ اس نے اس امر کی خاص احتیاط کی کہ کوئی بات جو اس نے سنی تھی قلم انداز نہ ہوجائے اور نہ کسی غلط بات کا اندارج ہو[4] "۔

پس مقدس مرقس ایک محتاط اور مستند مورخ تھے اوران کا پایہ اعتبار اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ انجیل اول اور موسوم کے مصنفین جو خود اعلیٰ درجہ کے نقاد تھے (لوقا ۱: ۱) انجیل مرقس کو لفظ بلفظ نقل کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔

دوم۔ رسالہ ک(Q) جواب موجود نہیں ہے یہ رسالہ تقریباً تمام کا تمام سیدنا مسیح کی تعلیم پر مشتمل تھا۔ اس کی نسبت بھی بزرگ پےپئس جو یوحنا رسول کا شاگرد تھا ۔ لکھتاہے "۔ متی نے سیدنا مسیح کے کلمات کو آرامی زبان میں لکھا تھا اور ہر شخص نے اپنی اپنی طرز کے مطابق اس کا استعمال یا (ترجمہ

[4] Euesbius.Hist.Eccl.iii.39,15.

کیا) ہے[5] " ۔آئرینوس بھی اس کی تائید کرتا ہے اورکھتاہے کہ " ۔ متی نے عبرانیوں کے لئے ان کی زبان میں انجیل تحریر کی[6] "۔

ان فقروں کا اطلاق موجودہ انجیل اول پر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ آرامی میں نہیں بلکہ یونانی زبان میں لکھی گئی تھی ۔ اوراس میں مرقس کی یونانی زبان کی انجیل لفظ بلفظ نقل کی گئی ہے۔ پس اغلب خیال یہی ہے کہ پے پئس کا مطلب رسالہ ک سے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا مسیح کے حواری ابتداہی سے سیدنا مسیح کے اقوال کو احاطہ تحریر میں لے آئے تاکہ کلمتہ اللہ کے اعجازی الفاظ ضائع نہ ہوں۔ اورآپ کے شاگردخود ان سے مطلع ہوسکیں اور نومریدوں کو بھی تعلیم دے سکیں ۔ چونکہ یہ نسخہ قدیم ترین تھا۔ لہذا نہایت معتبر اور مستند تھا۔

نسخہ "ک" کے مضامین کیا تھے؟ اس موضوع پر علمائے مغرب مدت سے بحث کرتے آئے ہیں اوراب قریباً سب[7] اس امر پر متفق ہیں کہ یہ رسالہ تعلیم پر مشتمل تھا۔ یہ رسالہ انجیل دوم سے پہلے لکھا گیا تھا۔ کیونکہ اس انجیل کے مطالعہ سے معلوم ہوتاہے کہ اس کا مصنف یہ فرض کرلیتا ہے کہ اس کے ناظرین کے ہاتھوں میں ایک نسخہ موجودہے جس میں منجئی عالمین کی تعلیم درج ہے۔

---

[5]Ibid.iii.39-16
[6] Irenaeus Against Heresies ,Bk.3 Ch.1.1
[7] Streeter's Essay on the Literary Evolution of the Gospels in Synoptic Problem edited by Sanday.

یہی وجہ ہے کہ اگرچہ مقدس اپنی انجیل میں الفاظ " تعلیم " اور " تعلیم دینا" کوباقی دونوں انجیلوں سے زیادہ استعمال کرتاہے تاہم وہ سیدنا مسیح کی تعلیم کا ذکر بہت کم کرتاہے بلکہ اسکی انجیل کا مرکز صلیبی واقعہ ہے ۔ سیدنا مسیح کی زندگی کے آخری ہفتے کے واقعات اس انجیل کے ۱/۳ حصہ سے زیادہ جگہ لیتے ہیں۔ درحقیقت یہ انجیل ایک تمہید اورصلیبی واقعہ کے بیان پر مشتمل ہے۔ بی وائس (B.WEISS) اور دیگر علماء کے خیال میں نسخہ "ک " میں واقعات تصلیب وقیامت بالکل نہیں تھے پس ثابت ہوگیاکہ انجیل مرقس کی تصنیف سے پہلے ایک نسخہ مسیحیوں کے ہاتھوں میں موجود تھا جس میں صرف کلمتہ اللہ کے کلمات طیبات ہی مندرج تھے۔ مقدس مرقس نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے انجیل لکھی جس میں سیدنا مسیح کی تعلیم کا مفصل ذکر نہ کیا۔ بلکہ سیدنا مسیح کی زندگی کے چند واقعات کا ذکر کرکے واقعاتِ تصلیب وقیامت اور صعودِ آسمانی کا مفصل ذکر کیا کیونکہ وہ واقعات نسخہ "ک" میں نہیں تھے۔

میری رائے میں سر ولیم ریمزے (Sir William Ramsay) کا خیال درست ہے کہ نسخہ "ک" صرف سیدنا مسیح کے زرین اقوال پرہی مشتمل تھا اوراس میں صلیبی واقعہ کاذکر نہیں تھا ۔لہذا یہ نسخہ صلیبی واقعہ سے پہلے سیدنا مسیح کی حین حیات ہی میں مرتب کیا گیا تھا۔ لیکن دیگر علماء کا خیال ہے کہ یہ نسخہ سیدنا مسیح کی وفات کے بع دلکھا گیا تھا ۔ بہر حال تمام علماء اس نسخہ کو

قدیم تریں تسلیم کرتے ہیں۔ پس کلمتہ اللہ کے اقوال کے لئے نسخہ "ک" سے زیادہ معتبر اور مستند رسالہ روئے زمین پر نہیں ہوسکتا۔

یہ نسخہ "ک" ہمارے ہاتھوں میں ایک جدا رسالہ کی شکل میں نہیں ہے لیکن چونکہ تمام کا تمام نسخہ انجیل اول، اور انجیل سوم میں لفظ بلفظ نقل کیا گیا ہے لہذا یہ نسخہ درحقیقت ضائع نہیں ہوا۔ دونوں انجیلوں میں نقل ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ بہر حال یہ ثابت ہوگیا کہ انجیل اول وسوم کے وہ مقامات جو تعلیم پر مشتمل ہیں نہایت معتبر اور مستند ہیں۔

سوم۔ انجیل سوم۔ یہ امر مسلم [8] ہے کہ اس انجیل کو اور اعمال الرسل کو مقدس لوقا نے تصنیف کیا تھا۔ اس انجیل کے ابتدائی الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ مقدس لوقا ایک نہایت محتاط مورخ تھے آپ نے اپنے ماخذوں کی جانچ پڑتال کرکے" سب باتوں کا سلسلہ شروع سے ٹھیک ٹھیک دریافت" کرکے اور صرف ان لوگوں کی گواہی قبول کرگئے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کے خادم تھے"۔ اپنی انجیل کو" ترتیب وار" لکھا۔ ان کی انجیل اس امر پر گواہ ہے کی انہوں نے یہ کام نہایت دیانتداری جانفشانی اور تندہی سے کیا۔ پس یہ انجیل ایک نہایت مستند اور معتبر نسخہ ہے۔

چہارم ۔ انجیل اول ۔ چونکہ انجیل اول کے مصنف نے "ک" کا استعمال کیا تھا جو مقدس متی نے لکھا تھا لہذا یہ انجیل مقدس متی کے نام سے موسوم ہوگئی۔ یہ انجیل مقدس مرقس کی انجیل پر مبنی ہے۔ ڈھانچہ وہی ہے جو انجیل دوم کا ہے اوراس ڈھانچہ میں نسخہ "ک " سے آٹھ مقامات اور چند دیگر معتبر اقوال اور واقعات مختلف "موزوں اور مناسب موقعوں پر داخل کردئیے گئے ہیں۔ مندرجہ بالا سطور میں ہم ثابت کرآئے ہیں کہ یہ سب ماخذ تواریخی حیثیت سے نہایت اعلیٰ پایہ کے ہیں۔ لہذا یہ انجیل بھی جو ان ماخذوں کو استعمال کرتی ہے معتبر اور مستند ہے۔

مذکورہ بالاچاروں کتابوں کی تاریخ تصنیف بھی ان کے معزز پایہ اعتبار کی تائید کرتی ہے مسیحی علماء اس بات پر متفق ہیں کہ یہ کتب پہلی صدی مسیحی کے دوران میں لکھی گئیں۔ چنانچہ عموماً یہ تسلیم کیا جاتاہے کہ انجیل مرقس یونانی زبان میں ۶۳ ء اور ۷۰ ء کے درمیان لکھی گئی اورانجیل اول وسوم ۸۰ء و ۹۰ ء کے درمیان لکھی گئیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری موجودہ یونانی انجیلیں سیدنا مسیح کی وفات کے پچاس ساٹھ سال کے اندر اندر احاطہ تحریر میں آگئی تھیں۔ پس ان کی تواریخ تصنیف ان کے معتبر ہونے پر ایک زبردست دلیل ہے۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ہماری چاروں انجیلیں مندرجہ بالا تاریخوں سے بہت پہلے احاطہ تحریر میں آچکی تھیں ۔ پادری ریکھیم صاحب (Rackham) تفسیر اعمال الرسل میں مدلل اور مبسوط طور پر یہ ثابت کرتے

[8] Harnak, Luke the Physician. (Williams and Norgate) 1907.

ہیں[9] کہ اعمال الرسل کی کتاب ۵۸ء اور ۶۰ء کے درمیان لکھی گئی آرچ ڈیکن ایلن (Archdeacon Allen) کے خیال میں انجیل اول ۵۰ء میں لکھی گئی چونکہ اول وسوم کے مصنفین ایک دوسرے کی تصنیفات سے مستغنی ہیں اور دونوں مقدس مرقس کی انجیل کا استعمال کرتے ہیں۔ پس انجیل دوم ۵۰ء سے پہلے مختلف اور دور دراز مقامات میں مقبول عام ہوچکی تھی۔ لہذا وہ ۴۰ء کے قریب لکھی گئی سیدنا مسیح کی وفات کے دس سال کے اندر اندر احاطہ تحریر میں آگئی۔ جب واقعات صلیب وقیامت وصعود آسمانی ہنوز شاگردوں کے دلوں میں تازہ تھے۔ سرولیم ریمزے کا خیال ہم درج کرچکے ہیں کہ نسخہ "ک" سیدنا مسیح کی عین حیات میں لکھا گیا تھا۔ پس ان علماء کے خیال میں ہمارے اصلی ماخذوں میں سے ایک سیدنا مسیح کی حیات میں لکھا گیا اور دوسرا آپ کی وفات کے دس سال کے اندر لکھا گیا اور سب سے بعد کی انجیل وفات کے صرف بیس سال کے اندر احاطہ تحریر میں آئی۔ ان سے زیادہ معتبر اور مستند کتاب کا ہونا ناممکنات میں سے ہے۔

پس اہل مغرب کی گذشتہ ڈیڑھ سو سال کی مساعی جمیلہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ہماری انجیلیں لاثانی کتب مقدسہ ہیں اور اعتبار کے لحاظ سے وہ آپ ہی اپنی نظیر ہیں ہم اس کے ثبوت میں مشہور مصنف ایڈورڈ مائر (Edward Meyer) کے الفاظ کو پیش کرتے ہیں جس نے مخالفانہ نظر سے لیکن بغیر تعصب کے مسیحی کتب مقدسہ کی تنقید اور چھان بین کی ہے اورجو ایسا مسلم الثبوت نقاد ہے کہ چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔ وہ انجیل دوم کی نسبت لکھتاہے کہ " وہ نتائج جس پر ہم پہنچے ہیں نہایت اہم ہیں یہ ظاہر ہے کہ مسیح کی سوانح عمری کے لئے ہمارے پاس دوسری یا تیسری نسل کے ماخذ نہیں ہیں بلکہ یہ ماخذ پہلی نسل کے لوگوں کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جو اس کو بخوبی جانتے تھے اورجن کے دلوں میں اس کی یاد ہنوز تازہ تھی۔ ان ماخذوں کو قبول نہ کرنے کی ہمیں کوئی وجہ نہیں ملتی۔ وہ تمام ضروری امور میں تواریخی حیثیت سے قابل وثوق ہیں اور ان کے واقعات کی ترتیب تاریخی طورپر صحیح معلوم ہوتی ہے "۔ یہ نقاد انجیل سوم کو" قدیمی تواریخی تصنیفات میں سے نہایت اہم" کتاب قرار دیتا ہے[10]۔

پس مخالف اور موالف اس امر پر متفق ہیں کہ ہماری موجودہ انجیلیں نہایت اہم اور اعتبار کے لحاظ سے دنیا کی تمام مقدس کتابوں میں عدیم المثال ہیں۔

(۳) اناجیل اور قرآن کے پایہ صحت کا مقابلہ

جب ہم اناجیل ثلاثہ کی صحت کا مقابلہ دیگر مذاہب کی کتب سے کرتے ہیں توہم پر اناجیل کی بے نظیری فوراً ظاہر ہوجاتی ہے۔ حضرت محمد

[9] Reckham, The Acts of Apostles pp.1.1v

[10] Quoted by Charles Gore in Jesus of Nazareth.pp.191-192

صاحب کی حین حیات میں قرآنی سورتوں میں اس قدر تفاوت تھا کہ صحیح مسلم میں عمر بن خطا کا قول ہے کہ " میں نے ہشام بن حکیم کو سورہ فرقان اور لوگوں کے خلاف پڑھتے سنا اور رسول اللہ مجھ کو یہ سورہ پڑھا چکے تھے سو میں قریب تھا کہ اس سے بھڑ جاؤں مگر میں نے اسے مہلت دی یہاں تک کہ وہ (نماز) پڑھ چکا۔ پھر میں اس کی چادر اس کے گلے میں ڈال کر اس کو رسول اللہ تک کھینچتا لایا"۔ (کتاب فضیلتہ القرآن) بخاری سے مشکواۃ میں " ابن مسعود سے روایت ہے کہ میں نے ایک شخص کو (قرآن) پڑھتے سنا اور میں نے نبی ﷺ کو اس کے خلاف پڑھتے سنا تھا۔ پس میں اس کو نبی ﷺ کے پاس لایا "۔ (باب فضائل القرآن) زید بن ثابت ہم کو بتاتا ہے کہ " جب نبی ﷺ نے وفات پائی تو قرآن کسی شے میں جمع نہ تھا"۔ (اتقان نوع ۱۹) حضرت ابوبکر کے عہد خلافت میں جب قرآن کے حافظ جنگ یمامہ میں کثرت سے قتل ہوگئے۔اور" یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ بہت سے حصہ قرآن کا ضائع ہوجائے تو زید بن ثابت نے جا بجا قرآن کو کھوج کیا اور اس کو کھجور کے پتوں ،پتھروں کی تختیوں، کاغذ کے پرزوں ، چمڑے کے پارچوں ، شانے کی ہڈیوں ، پہلو کی ہڈیوں اور کجاوہ کی لکڑیوں اور آدمیوں کے سینوں پر نہایت منتشر حالت میں پایا" لیکن حضرت عمر کے قرآن کو مرتب کرنیکے باوجود خلافت عثمانیہ میں قرآن میں اس قدرت اختلاف موجود تھا کہ حضرت عثمان کو ازسر قرآن کی تالیف کرنی پڑی۔ اوراس نے مصحفِ عثمانی کے سوا تمام قرآن کے نسخے اورحصے نذر آتش کرکے ان کثیر التعداد اختلافات کا خاتمہ کردیا۔

اسلامی احادیث کا کچھ نہ پوچھو۔ امام بخاری نے حضرت محمد کی وفات کے تقریباً اڑھائی سوسال بعد چھ لاکھ احادیث جمع کیں لیکن صرف چارہزار کومستند قرار دیا۔ اورچالیس ہزار راویوں میں سے صرف دوہزار کو معتبر سمجھا۔

امام مسلم نے حضرت محمد کی وفات کے اڑھائی سو سال بعد تین لاکھ حدیثیں جمع کیں لیکن صرف چار ہزار کو صحیح یا تقریباً صحیح قرار دیا۔ ابوداؤد نے حضرت محمد کی وفات کے تقریباً پونے تین سوسال بعد پانچ لاکھ احادیث، جمع کیں ۔ لیکن صرف چارہزار آٹھ سو کو درج کرکے کہا " میں نے اپنی کتاب میں صحیح کو جمع کیا ہے اوران کو جومجھے صحیح معلوم دیں یا وہ جو میں نے صحیح خیال کیں"۔ اس قدر کاوش کے بعد بھی علمائے اسلام ان کتب کی احادیث میں سے ایک بڑی تعداد کو غیر معتبر ضعیف موضوع اوربے سروپا تصور کرتے ہیں مذکورہ بالاواقعات اس امر کی دلیل ہیں کہ اصلی اسلامی تعلیم کو معلوم کرنے کے لئے اسلامی ماخذ کس قدر ناقص اور پایہ اعتبار سے ساقط ہیں۔ ہر روشن خیال شخص دیکھ سکتا ہے کہ ان ذرائع اور مسیحی تعلیم کے ماخذوں کے پایہ اعتبار میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

ببیں تفاوتِ راہ ازکجاست تابکجا

(۴) انجیل چہارم

ہم نے دیدہ ودانستہ انجیل چہارم کا ان ماخذوں کے تحت میں ذکر نہیں کیا نقادانا جیل ثلاثہ کی نسبت مسلم نتائج پر پہنچ چکے ہیں ۔ لیکن انجیل چہارم ہنوز زیر بحث اس کے ذکر نہ کرنے سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ یہ انجیل پایہ اعتبار سے ساقط ہے۔

اس کا تواریخی پایہ بہت بڑا[11] ہے۔ مثلاً تقریباً سب علماء اس امر پر متفق ہیں کہ واقعہ تصلیب کی صحیح تاریخ صرف اسی انجیل میں محفوظ ہے۔ پھر اناجیل ثلاثہ ہم کو کنایتہً بتاتی ہیں کہ کلمتہ اللہ نے یروشلیم اوریہودیہ میں بھی منادی کی تھی لیکن یہ منادی صرف اسی انجیل میں محفوظ ہے اور اس انجیل کی تعلیم یہودیہ کے حسب حال بھی ہے کیونکہ وہاں گلیل کے جاہل نہیں بلکہ علمائے فقہیہ اور فریسی رہتے تھے ۔ علاوہ ازیں یہ ایک امر ناممکن ہے کہ کلمۃ اللہ نے اپنی تیس سالہ زندگی میں صرف وہی کلمات فرمائے ہوں جو اناجیل ثلاثہ میں مندرج ہیں اور ان کے علاوہ آپ کی زبان معجز بیان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا ہو۔ لہذا یہ امر یقینی ہے کہ انجیل چہارم کے اگر تمام کلمات نہیں تو اکثر کلمات ضرور سیدنا مسیح کے منہ سے صادر ہوئے تھے لیکن اس رسالہ میں چند وجوہ کے باعث ہم سیدنا مسیح کی تعلیم کومعلوم کرنے کے لئے انجیل چہارم کا تفصیلی ذکر نہ کریں گے اوراس سے صرف ان کلمات اور واقعات کو اختیار کریں گے جو اناجیل ثلاثہ کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اوران اناجیل کی تعلیم پرروشنی ڈالتے ہیں کیونکہ مخالف وموالف دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ اناجیل ثلاثہ میں منجئی عالمین کی تعلیم محفوظ ہے۔

(۵-) انجیل کی زبان اور متن کی صحت

بعض اصحاب انجیلی تعلیم کی صحت پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کلمۃ اللہ نے توآرامی زبان میں تعلیم دی ۔ لیکن انجیل یونانی زبان میں ہے لہذا زبان کے اختلاف کا اثر مسیحی تعلیم پر ضرور پڑا ہوگا۔ یہ سچ کہ آنخداوند کی مادری زبان ارامی تھی چنانچہ ڈاکٹر فروریدر کھتا ہے " مسیح یونانی زبان نہیں بولتے تھے اس میں شک نہیں کہ وہ ارآمی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے جو اس زمانہ میں کنعان کی زبان تھی [12]۔ لیکن اس اعتراض میں کچھ وزن تب ہی ہوسکتا جب معترض یہ ثابت کرسکے کہ کلمۃ اللہ کے آرامی کلمات اور موجودہ اناجیل کے یونانی الفاظ میں مغائرت اور تضاد ہے۔ جو اشخاص ارآمی اور یونانی زبانوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ مغائرت اور تضاد یک طرفہ ، دونوں میں حیرت انگیز مطابقت ہے۔

[11] Sanday, Criticism of the Fourth Gospel.

[12] Fairweather,Jesus and the Greeks.p.271.

ہم سطور بالا میں لکھ آئے ہیں کہ کلمتہ اللہ کی حین حیات ہی آپ کے کلمات طیبات آرامی زبان میں احاطہ تحریر میں آچکے تھے علاوہ ازیں جن رسالوں کا ذکر مقدس لوقا کرتاہے (۱:۱) وہ بھی ابتدائی زمانہ میں آرامی زبان میں تحریر ہوچکے تھے اور یہ ایک قدرتی بات بھی تھی۔ کیونکہ آنخداوند کے اولین شاگرد یہودی تھے جن کے لئے آرامی زبان میں ان رسالوں کا ہونا لازمی امر تھا تاکہ وہ سیدنا مسیح کے کلمات اور سوانح حیات سے خود واقف ہوسکیں اور دوسروں میں ان کی تبلیغ کرسکیں۔

کتاب اعمال الرسل سے ظاہر ہے کہ صعود آسمانی کے واقعہ کے چند سالوں کے اندر اندر یہود ہزاروں کی تعداد میں مسیحیت کے حلقہ بگوش ہوگئے اور یہ تحریک سلطنت روم کے ہر قریہ اور شہر میں پھیلتی گئی۔ پس ضرورت کو مدِ نظر رکھ کر ان غیر یہود مسیحیوں کے لئے ان رسالوں کا یونانی زبان میں ترجمہ کیا گیا تاکہ مختلف ممالک کی کلیسیائیں انجیل کے جانفزا امژدہ سے بہرہ ور ہوسکیں۔

منجئی عالمین کی وفات کے تیس سال بعد یروشلیم کی بربادی کا سانحہ جانکاہ پیش آیا اوریہودی قوم خستہ اور تباہ حال ہوکر پراگندہ ہوگئی جس کی وجہ سے ارامی زبان ختم ہوگئی اور یونانی کو ہر مہذب ملک میں بیش از پیش فروغ حاصل ہوگیا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اناجیل اربعہ کی نقلیں ارامی زبان میں کم اور یونانی زبان میں زیادہ ہوتی گئیں۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا۔جب آرامی زبان کے نسخے نادر ہوکرآہستہ آہستہ معدوم ہوگئے اور دوسری تیسری صدی مسیحی کے صرف یونانی زبان کے نسخے ہی نقل ہوتے ہوگئے۔

ڈاکٹری ٹوری G.G Torray پروفیسر برنی Burney آرچڈیکن ایلن Allen وغیرہ علماء کا گروہ کہتاہے کہ اناجیل اربعہ کا یونانی متن ان آرامی اناجیل کالفظی ترجمہ ہے جو ۴۰ء اور ۵۰ءکےدرمیان یعنی منجئی عالمین کی وفات کے دس بیس سال کے اندر اندر انجیل نویسوں نے ارامی زبان میں تصنیف کی تھیں دیگر علماء کا یہ خیال ہے کہ یونانی اناجیل اصل ارامی ماخذوں سے ۶۰ء کے بعد تصنیف کی گئیں لیکن تمام کے تمام علماء اس ایک امر پر متفق ہیں کہ آنخداوند کی ارامی زبان اور موجودہ یونانی متن میں کسی قسم کی مغائرت نہیں ہے چنانچہ یہاں ڈاکٹر ہارنیک Harnack جیسے مسلم الثبوت نقاد کے الفاظ نقل کرادینے کافی ہوں گے ۔ وہ کہتا ہے " یونانی زبان جس میں اناجیل لکھی گئی ہیں۔ ان تحریرات پر ایک شفاف پردے کی طرح ہیں اور بغیر کسی کوشش کے ان کی عبارت عبرانی یا آرامی زبانوں میں ترجمہ ہوسکتی ہے۔ یہ اظہر من الشمس ہے کہ جو باتیں ان میں محفوظ ہیں ان کا تعلق ابتدائی زمانہ سے ہے اور اصلی ہیں[13] ۔

پس ہر پہلو سے کلمۃ اللہ کی تعلیم کی صحت ثابت ہے۔

---

[13] Harnack, what is Christianity? Lect.2.

(ب) مسیح کی آمد کے وقت ارضِ مقدس کے حالات

(۱-)سیاسی حالات: جب سیدنا مسیح اس دنیا میں آئے تو رومی قیاصرہ اہل یہود پر حکمران تھے۔آپ کی آمد سے تقریباً ساٹھ سال پہلے رومی جرنیل پومپئی Pompey نے یروشلیم فتح کرلیا تھا۔ اور حشمونی خاندان کے آخری یہودی بادشاہ اور اس کے ہزاروں ماتحتوں کو مقید کرکے روم لے گیا تھا لیکن گو قیاصرہ اہل یہود پر قابض ہوگئے تھے تاہم شروع میں وہ یہودیہ پر اپنے گورنروں کے ذریعہ حکومت نہیں کرتے تھے ۔ ۳۷ء قبل مسیح میں روم نے ہیرودیس اعظم کو ارض مقدس پر حکمران مقرر کیا۔ یہ شخص نسلاً ادومی تھا ۔جن سے اہل یہود سخت عداوت رکھتے تھے ۔ ہیرودیس یہودی مذہب رکھتا تھا لیکن یونانیت کی جانب بہت راغب تھا۔ جہاں اس نے خداوند یہوواہ کے لئے یروشلیم میں ایک ہیکل کھڑی کردی تھی وہاں مشرکانہ معبودوں کے لئے اس نے مختلف ممالک میں جابجا شہر آباد کئے تھے اور عظیم الشان مندر بھی تعمیر کردئیے ۔ اس کا لشکر جرار ، تھریس، جرمنی، اور بنگال (Thrace, Germany & Gaul) کے باشندوں سے بھرا پڑا تھا اور اگر اس کو کسی شخص کی وفاداری پر شبہ ہوتا تو فوراً اس کا کام تمام کردیتا ۔ حتیٰ کہ وہ اپنے خاندان کے شرکاء کے خون کا پیاسا ہوگیا۔ اوراس نے ان میں سے بہتیروں کو موت کے گھاٹ اتاردیا۔ بالآخر سیدنا مسیح کی پیدائش کے ایک دوسال بعد ۴ء قبل مسیح)اس نے وفات پائی اور اس کے بعد اس کی مملکت اس کے بیٹوں میں تقسیم کردی گئی۔ لیکن ملک میں فتنہ وفساد بڑھتا گیا اور بغاوتوں کی وجہ سے خون کی ندیاں بہہ گئیں چنانچہ ہیرودیس کی موت کے تھوڑی دیر بعد دوہزار یہودی یروشلیم میں مصلوب کئے گئے ۔ لیکن صورت حالات نہ بدلی۔ نوسال تک یہی حال رہا بالآخر قیصر اگسطس نے بجز اس کے کوئی چارہ نہ دیکھا کہ یہودیہ کو اپنی سلطنت میں شامل کرکے قیصرہ میں ایک گورنر مقرر کردے ۔ کلمۃ اللہ کی بعثت کے وقت پنطوس پلاطوس پانچواں گورنر تھا۔ اس نے دس سال تک (از ۲۶ء تا ۳۶ء) حکومت کی۔

(۲-)اہلِ یہود کے مذہبی فرقے

اہل یہود شرک کے جانی دشمن اور موحد تھے۔ وہ توحید کے قائل اور انبیاء اللہ اور کتب سماوی کے ماننے والے تھے سیدنا مسیح کے ہم عصر یہودیوں کے عموماً دوفریق تھے۔

اول صدوقی ۔ اس پولٹیکل پارٹی میں بالعموم یہودی اور امراء شرفاء اور سردار کاہن داخل تھے۔ یہ لوگ یونانی خیالات سے متاثر ہوچکے تھے لہذا ڈاکٹر یہودی خیالات کے نہیں تھے ۔ رومی زمانہ میں گوان کا اقتدار کم ہوگیا تھا تاہم سردار کاہن اسی پارٹی کے شرکاء ہوتے تھے ۔یہودیوں کی مجلس سنہیڈرن میں ان کو بڑا رسوخ حاصل تھا۔ اس مجلس کو رومی فرمانرواؤں کے ماتحت بڑا اختیار حاصل تھا صدوقیوں کا حلقہ رسوخ زیادہ تر یروشلیم کا علاقہ اورہیکل کی چاردیوار تھی لہذا ان کواپنا رسوخ قائم رکھنے کے لئے اپنے مخالفت فریسیوں کی

پالیسی پر عمل درآمد کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ عوام الناس میں ان کا رسوخ بڑا زبردست تھا۔ چونکہ ان کا نصب العین اپنے حقوق کی حفاظت اور ملک کی سیاسی فلاح وبہبودی تھی لہذا قومی اور مذہبی پاکیزگی کی طرف وہ چنداں دھیان نہیں کرتے تھے چونکہ وہ مرفہ الحال تھے لہذا وہ موجودہ حالات سے خوش اور ہر طرح کے انقلاب سے متنفر تھے کیونکہ ان کو ہر وقت یہ خدشہ دامنگیر تھا کہ کہیں رومی فاتحین ان کے حقوق اوراختیارات نہ چھین لیں (انجیل شریف راوی حضرت یوحنا ۱۱: ۴۸) درحقیقت یہی لوگ تھے جنہوں نے ابن اللہ کو مصلوب کروایا تھا۔(انجیل شریف راوی حضرت مرقس ۱۵: ۱۰تا ۱۱)۔

دوم۔ فریسی۔ عوام الناس میں فریسیوں کے خیالات گھر کرچکے تھے۔ کیونکہ سیدنا مسیح کے زمانہ کی یہودیت درحقیقت فریسی خیالات پر ہی مشتمل تھی۔ چونکہ یہ جماعت اہل شرک کے ساتھ قید بابل کے زمانہ سے برسر پیکاررہی۔ لہذا اس کے شرکاء ہمیشہ کٹر خیالات کے تھے۔ خدا کی وحدانیت عبادتخانوں کی نماز، عہد عتیق کی کتب اوران کے فقیہوں کی تفاسیر وروایات روزسبت پر سختی سے عملدرآمد اوراہل شرک کی رسوم سے بیزاری، اس جماعت کے اجزائے ایمان اور ظغرائے امتیاز تھے۔ مکابیوں کےزمانہ میں (از ۱۳۵ء قبل مسیح تا ۱۰۵ء قبل مسیح) یہ پارٹی صدوقیوں سے الگ ہوگئی تھی ۔ ان کی حتی الوسع یہ کوشش تھی کہ جس طرح صدوقی سردار کاہن ہیکل کی چار دیواری کے اندر رسمی طورپر پاک رہتے تھے وہ اپنی روزمرہ زندگی میں رسمی پاکیزگی حاصل کریں۔

فریسیوں کی تعلیم ذیل کے امور میں صدوقیوں کی تعلیم سے مختلف تھی۔

(۱۔) صدوقی غالباً صرف موسوی شریعت یعنی عہدِ عتیق کی پہلی پانچ کتب کےقائل تھے۔ لیکن فریسی اس کے علاوہ دیگر صحائف انبیاء، اور"باپ دادوں کی روایات"۔ علم فقہ کو بھی اشد ضروری خیال کرتے تھے۔ (انجیل شریف راوی حضرت متی ۱۵: ۲، راوی حضرت مرقس ۷: ۳)۔

(۲۔) فریسی حیات بعد ازممات، قیامت، فرشتگان، جنت ودوزخ، عالم، ارواح اور مسیح موعود کی بادشاہت کےقائل تھے۔ لیکن صدوقی ان امور کو نہیں مانتے تھے۔ (انجیل شریف راوی حضرت متی ۲۲: ۲۲۔راوی حضرت مرقس ۱۲: ۱۸۔اعمال ۲۳: ۸)۔

(۳۔) فریسی مسئلہ جبر اور خود مختاری کے قائل تھے۔ لیکن صدوقی جبر اور تقدیر کے منکر تھے۔

(۴۔) فریسی محبِ وطن تھے۔ لیکن خدا کو سیاسی سلطان مان کر ہر طرح کے دنیاوی بادشاہ(یہودی اور غیریہودی) مخالف تھے۔

(۵۔) فریسی یہودیت کی تبلیغ کے حامی تھے۔ اور غیر اقوام کو یہودیت کے حلقہ میں داخل کرتے تھے۔ ربی حلیل کاقول ہے کہ" لوگوں کوپیار

کرو، اور ان کو شریعت کے پاس لاؤ"۔ لیکن صدوقی تبلیغی کوششوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

(۶۔) صدوقیوں کا حلقہ رسوخ ہیکل کی چار دیواری تک محدود تھا۔ لیکن فریسیوں کا رسوخ عبادت خانوں اور ربیوں کی درسگاہوں کے ذریعہ عوام الناس میں پھیلاہوا تھا۔

فریسیوں کا ایک بڑا گروہ ایسا تھا جس کے شرکاء تین گواہوں کے سامنے یہ وعدے کیا کرتے تھے کہ وہ تمام اشیائے خوردنی پر دہ دیکی ادا کریں گے" اور گنہگاروں کے ساتھ کسی طرح کا میل نہیں رکھیں گے اور رسمی پاکیزگی کو ہمیشہ مد نظر رکھیں گے۔

فریسیوں کی ایک بڑی تعداد فقیہوں کی تھی۔ شریعت اوراحکام الہٰی اور بزرگوں کی روایات کا مطالعہ کرنا ان کا شب وروز شغل تھا (زبور ۱: ۲) اسی فاضل گروہ کے اصولوں پر فریسی چلتے تھے (انجیل شریف۔ متی ۲: ۱۶، لوقا ۵: ۳۰) چونکہ صدوقی بھی توریت شریف پر ایمان رکھتے تھے۔ لہذ ان کے بھی فقیہ تھے جو صرف شریعت کے مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ اناجیل سے ظاہر ہے کہ فقیہ اعلیٰ مراتب پر فائز تھے کیونکہ جہاں سردار کاہنوں اور بزرگوں کا ذکرآتا ہے وہاں فقیہ بھی اسی زمرہ میں شمار کئے جاتے ہیں (متی ۲۰: ۱۸۔ لوقا ۲۰: ۱۰۔ متی ۲۶: ۵۷ وغیرہ) فقیہوں نے عوام میں کاہنوں کی جگہ غضب کرلی تھی۔ اور لوگوں کو عبادت خانوں میں اور ربیوں کی درسگاہ میں تعلیم دیتے تھے۔ عوام الناس ان سے مرعوب رہتے تھے۔ انہی فقیہوں کے جانشینوں نے مابعد کے زمانہ میں طالمود کو مرتب کیا۔ اس گروہ کے اندر بھی اختلافات اور فرقہ بندیاں موجود تھیں۔ مثلاً ہیرودیس اعظم کے زمانہ میں ربی حلیل اور ربی شمعون کے مقلدین موجود تھے لیکن گروہ کے باہر شخص ان کے فتاویٰ کے سامنے سر تسلیم خم کرتا تھا۔

کلمۃ اللہ کے زمانہ میں یہودی اصلاح کی سخت محتاج تھی۔ یہودی ربیوں نے شریعت پر کاربند ہونا اخلاقی زندگی کا مترادف قرار دے رکھا تھا۔ پس ان کا یہ خیال تھا کہ جو شخص شریعت کو جانتا اوراس پر عمل کرتا ہے وہ نیک ہے اور جو شریعت کو نہیں جانتا اوراس پر عمل نہیں کرتا وہ بد ہے۔ لیکن شریعت ظاہری افعال پر ہی نگاہ کرسکتی ہے لہذا فریسی انسانی جذبات اورخیالات کو محسوب نہیں کرتے تھے علاوہ ازیں بزرگوں کی روایات نے لوگوں کا دم ناک میں کررکھا تھا۔ کیونکہ اول تو شریعت پر کاربند ہونا کوئی آسان امر نہیں تھا اس پر طرہ یہ کہ بزرگوں کی روایات پر کاربند ہونا بھی شریعت کی طرح لازمی قرار دیدیا گیا تھا۔ حالانکہ ان قوانین میں سے چند ایسے تھے جن پر عمل کرنا اچھا نہ تھا (مرقس ۷: ۱۱ تا ۱۲) عوام الناس کے لئے یہ قوانین بڑے بھاری بوجھ تھے" اور جو ان پر عمل کرتے تھے وہ اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ وافضل شمار کرتے تھے (لوقا ۱۸: ۱۱ تا ۱۳) جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی روحانی حالت روز بروز زوال پذیر ہوتی گئی۔

جس طرح فریسی اور فقیہ یہود عامتہ الناس کو بنظر حقارت دیکھتے تھے اسی طرح اہل یہود دیگر اقوام عالم کو بنظر حقارت دیکھتے تھے اور اپنے آپ کو افضل واعلیٰ خیال کرتے تھے۔آلِ ابراہیم میں سے ہونا ان کے لئے مایہ ناز تھا۔ اوریہی فخر ان کے مذہب کاجزولاینفک تھا اور وہ اپنے آپ کو خدا کی برگزیدہ قوم خیال کرتے تھے۔ اور اگر اقوامِ عالم سے الگ تھلگ رہتے تھے تاکہ ناپاک نہ ہوجائیں۔ وہ آل ابراہیم ہونا جنت میں داخل ہونے کے لئے کافی سمجھتے تھے پس وہ اپنے اخلاق کو سدھارنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ فاضل یہودی ڈاکٹر مونٹی فیوری (Montefiore)کہتا ہے کہ " اہل یہود کو اس امر کا پختہ یقین تھا کہ وہ آلِ ابراہیم ہونے کی وجہ سے وہمیشہ کی زندگی کی برکات میں شریک ہوں گے۔ ان کا یہ ایمان تھا کہ باستثنائے چند انتہائی گنہگاروں کے تمام یہود کا حصہ ہمیشہ کی زندگی میں ہوگا[14] ۔

منجئی عالمین کے زمانہ میں ہم کو اچھے اور بُرے فریسی دونوں ملتے ہیں ۔ جہاں ایسے فریسی تھے جنہوں نے صدوقیوں کے ساتھ سازش کرکے ابن اللہ کو صلیب دلوادی تھی۔ وہاں زکریا ۔ یوسف ، ایلسبات ،شمعون اوریوسف آرمتیہ جیسے راستباز فریسی بھی موجود تھے۔

گلیل کا صوبہ فریسیوں کا محکم قلعہ تھا۔اسکے باشندے مسیح موعود کی آمد کے انتظار میں رہتے تھے۔ وہ رومیوں کے غلام تھے۔ پر سمجھتے تھے کہ خدا نے ان کو آزادی عطا کی ہوئی ہے یہی وجہ تھی کہ یہ صوبہ ان تمام بغاوتوں کا مرکز تھا جو رومی حکومت کے خلاف ہوتی تھیں ان کے سرغنہ بھی گلیلی ہوتے تھے اور جو شخص بھی مسیح ہونے کا دعویٰ کرتا وہ اس کے پیچھے لڑنے مرنے کو تیار ہوجاتے تھے۔ ان میں انتہا پسندوں کا ایک گروہ تھا" جو غیرت مند" یا زیلوتیس Zealots کہلاتا تھا۔ سیدنا مسیح کا ایک شاگرد بھی اس گروہ کا ممبر تھا(لوقا ۶ : ۱۵)۔

(ج)سیدنا مسیح کا طریقہ تعلیم

اناجیل کلمتہ اللہ کی نسبت بہت سی باتیں مندرج ہیں۔ لیکن جوبات سب سے زیادہ آپ کی نسبت بار بار تحریر کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ ایک معلم تھے جوشب وروز لوگوں کو تعلیم دینے میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کی تعلیم صرف کلمات پر ہی مشتمل نہ تھی۔ بلکہ آپ اپنی نشست وبرخاست رفتار وگفتار، انداز گفتگو۔ اور طرز زندگی وغیرہ کے کامل نمونہ سے نہایت موثر طور پر تعلیم دیتے تھے۔

(۱ ۔) کلمتہ اللہ کا مکتب

ہم ذکر کرچکے ہیں کہ گلیل کا صوبہ فریسی خیالات کا ایک محکم قلعہ تھا۔ کلمتہ اللہ کے خیالات نے اس فضا میں پرورش پائی تھی۔ آپ نے شریعت اورصحفِ انبیاء کا بخوبی مطالعہ فرمایا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ نے صحیفہ

[14]Encyclopedia Biblica Vol.4.p.2440.

فطرت کا مطالعہ بھی کیا تھا جس کی جھلک ہم کو اناجیل میں ملتی ہے۔آپ ہمیشہ آسمانی باپ کی رفاقت میں رہتے تھے۔ اور اس رفاقت نے آپ پر الہیٰ معرفت کے کرشمے ظاہر کردئیے تھے جو آپ کی زبان حقیقت ترجمان سے صادر ہوتے تھے آپ کی جدت پسند طبع فریسیوں اور ربیوں کی تعلیم سے مستغنی تھی۔آپ کتبِ سماوی کی ایسی نرالی تفسیر کیا کرتے تھے کہ سامعین انگشت بدنداں رہے جاتے اور بے اختیار کہتے کہ وہ ان کو "فقیہوں کی طرح نہیں بلکہ صاحب اختیار کی طرح تعلیم دیتا تھا"(مرقس ۱: ۲۲۔ متی ۷: ۲۸تا ۲۹) یہی وجہ تھی کہ" عام لوگ خوشی سے " ۔آپ کی تعلیم کو سنتے تھے۔ (مرقس ۱۲: ۳۷)یہاں تک کہ بھیڑوں کی بھیڑیں آپ کی تلاش کرتی ہوئی آپ کے پاس آکر منت کرتیں کہ" ہمارے پاس نہ جا"۔(لوقا ۴: ۲۳) جب ہم ربیوں کی تفسیروں کے بعد کلمۃ اللہ کے اقوال پڑھتے ہیں۔ توہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک تنگ وتاریک زندان سے جہاں دم گھٹتا تھا آزاد ہو کر خدا کی عطا کردہ تازہ ہوا میں نکل آئے ہیں۔ عہدِعتیق کی کتب سماوی کے حقیقی اور اصلی مطالب اور مقاصد کو کلمۃ اللہ نے کماحقہ، سمجھا آپ کی تعلیم سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ آپ میں اور خدا میں کوئی درمیانی نہیں تھا اورآپ سیدھا خدا سے حاصل کرکے لوگوں کو تعلیم دیتے تھے۔آپ نے خود فرمایا" جو ہم جانتے ہیں وہ کہتے ہیں اورجسے ہم نے دیکھا ہے۔ اس کی گواہی دیتے ہیں"(یوحنا ۳: ۱۱)آپ یہودی ربیوں کے اقوال کا حوالہ نہیں دیتے تھے "آپ یہ نہیں کہتے تھے کہ میرے فلاں استاد نے فلاں بات کہی ہے ۔آپ کبھی کبھی شریعت اور صحف انبیاء کا ذکر کرتے تھے لیکن آپ نے ان کتب کواپنی تقریر الفاظ کی بنیاد نہ بنایا آپ وہی پیغام دیتے تھے اوروہی کلام منہ سے نکالتے تھے جو خدا کی روح آپ کو بولنے پرراغب کرتی تھی[15] ۔

لیکن فریسیوں ، فقیہوں اور ربیوں کی نگاہ میں کلمۃ اللہ عامتہ الناس میں سے ایک جاہل تھے جنہوں نے کسی یہودی ربی کے قدموں میں بیٹھ کر علم الہیات کی تحصیل نہیں کی تھی یہودی ربی ان لوگوں کو جوربیوں کے قدموں میں بیٹھ کر حاصل نہیں کرتے تھے" جاہل" ،حیوان مطلق"، سامری" وغیرہ کہتے تھے[16] ۔ کلمۃ اللہ جیسے" اُمی " اورناتجربہ کار تیس سالہ جوان کا بزرگان دین کو کہنا کہ" تم گمراہ ہوکیونکہ نہ کتاب مقدس کو جانتے ہو نہ خدا کی قدرت سے واقف ہو"۔ (مرقس ۱۲: ۲۴) ان کی نظر میں پرُانے درجے کی حماقت اورناقابل برداشت گستاخی تھی ۔ یہودی ربیوں کا طبقہ رجعت پسند تھا ان کا یہ قاعدہ تھا کہ مکھی پر مکھی مارتے تھے ۔ اورمروجہ عقائد سے باہر ایک قدم بھی نہیں تھے۔ جب تک ان کے قول کے لئے ان کے پاس متقدمین سے کسی مستند عالم کی سند موجود نہ ہو۔

ع

آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگوئم

---

[15] Montefiore,Hibbert Lectures.p.482
[16] Montefiore ,Religious Teachings of Jesus Christ.pp.113-4

فقہہ عام معنوں میں " صاحب اختیار" معلم تھے۔ وہ اسرائیلی نظام کے مقبول شدہ اور مقرر کردہ استاد تھے۔ لیکن گو عوام الناس جاہل تھے ۔ تاہم ان میں اس قدر عقل ضرور تھی کہ وہ ان معلموں میں اور خدا کے فرستادہ معلم میں تمیز کرسکیں ۔جب وہ کلمتہ اللہ کی زبان معجز بیان سے الہیٰ حقائق سنتے تو بے ساختہ بول اٹھتے کہ" آپ ان کو فقیہوں کی طرح نہیں بلکہ صاحب اختیار لوگوں کی طرح تعلیم دیتے تھے (مرقس ۲: ۷) کلمتہ اللہ جو ان فریسیوں کی آنکھوں میں ایک معمولی نوخیز جوان تھے(متی ۱۳: ۵۶) نہ کسی مستند عالم کی سند کی پرواہ کرتے تھے اور نہ کسی مروجہ عقیدہ کا لحاظ رکھتے تھے بلکہ ظاہری رسوم ورواج کو بیدریغ پاؤں تلے روندتے تھے ۔ اورایسی تعلیم دیتے تھے جس سے ربیوں کے کان مانوس نہیں تھے اور جو بعض اوقات ان کی نظر میں کفر سے کم نہ تھی(مرقس ۲: ۷) پس وہ چڑکر آپے سے باہر ہوجاتے اور کلمتہ اللہ سے پوچھتے " تو ان کاموں کو کس کے اختیار سے کرتاہے؟ وہ کون ہے جس نے تجھ کو یہ اختیار دیا ہے(مرقس ۱۱: ۲۸-لوقا ۲۰: ۲) یہودی ربی کتابوں کے کیڑے تھے)جوبات بات پرمسلم الثبوت استادوں اوربزرگانِ دین اور مقتدایانِ یہودیت کے اقوال اپنی تائید میں پیش کیا کرتے تھے اور منطقیانہ استدلال سے کام لیتے تھے لیکن معرفت الہیٰ کی کنجی کلمتہ اللہ کے پاس ہی تھی۔ کیونکہ عشقِ الہیٰ کی آگ آپ کے سینہ میں بھڑکتی تھی۔ مرحوم ڈاکٹر اقبال کیاخوب فرماتےہیں کہ:

شنید شب در کتب خانہ من
بہ پروانہ گفت کرم کتابی
بااوراق سینا نشیمن گرفتیم
بے دیدم از نسخہ فاریابی
نفہمیدہ ام حکمت زندگی را
ہماں تیرہ روزم زبے آفتابی
نکو گفت پروانہ نیم سوزے
کہ ایں نکتہ رادار کتابے نیابی
تپش مے کند زندہ ترزندگی را
تپش مے دہد بال وپرزندگی را

(۲-) کلمتہ اللہ کے سامعین

فریسی معلم عوام الناس کو بنظرِ حقارت دیکھتے تھے ۔ لفظ" فریسی" کا مطلب ہی " عوام الناس سے الگ" رہنا ہے۔ ان کا مقولہ تھا کہ" یہ عام لوگوں جو شریعت سے واقف نہیں لعنتی ہیں"۔ (یوحنا ۷: ۴۹)وہ "گھنونے ہیں۔ اوران کی عورتیں ناپاک حشرت الارض ہیں"۔ ان کا یہ خیال تھا کہ وہ عام لوگوں کو چھونے سے ناپاک ہوجاتے ہیں۔عوام جس پھل کوہاتھ لگائیں وہ ناپاک ہوجاتاہے اور کہ وہ حیوانات سے بد تر ہیں اوران کی شہادت قابلِ قبول

نہیں[17]۔ ربی حلیل کا قول تھا کہ "کوئی اجڈ گنوار گناہ کرنے سے نہیں جھجک سکتا اور عامتہ الناس صالح نہیں ہوسکتے[18]۔ حکم تھا کہ "اگران میں سے کوئی شخص صالح بھی ہو تو بھی اس کے پڑوس میں مت رہو۔ ان کے عبادت خانوں میں ان کے پاس بیٹھنا موت سے بد تر خیال کیا جاتا تھا[19] لیکن کلمتہ اللہ عوام الناس کو کوڑ مغز بے بصیرت یا ملعون خیال نہیں کرتے تھے بلکہ آپ کی دلی آرزو تھی کہ عام لوگ پیغام الہیٰ کو سنیں۔ اور سوچ سمجھ کر اس کو قبول کریں(متی ۱۳: ۱۶) آپ کا دل عوام الناس کی ابترحالت کودیکھ کر بھر آتا(متی ۱۴: ۱۴)۔ کیونکہ ان کا کوئی حقیقی معلم اورہمدرد نہ تھا" وہ ان بھیڑوں کی مانند تھے جن کا چرواہا نہ ہو"(مرقس ۶: ۲۴) ان کی جہالت آپ کےدل میں بے صبری کی جگہ ترس اور محبت کے جذبات پیدا کرتی تھی (متی ۹: ۳۶) یہی وجہ تھی کہ کہ جہاں ربیوں میں اورعوام میں عداوت رہتی حتیٰ کہ ربی الیعزر کہتا ہے کہ کفارہ کے روز عوام میں سے کسی کو قتل کرنا بھی جائز ہےوہاں عوام الناس "خوشی سے آپ کی تعلیم کو سنتے تھے۔(مرقس ۱۲: ۳۷)۔ آپ ہر وقت اور ہرجگہ الہیٰ محبت کا پیغام لوگوں کوسناتے تھے اور فرماتے تھے کہ آپ اسی مقصد کو انجام دینے کے لئے دنیا میں بھیجے گئے ہیں(لوقا ۴: ۴۳، مرقس ۱: ۳۷) لوگ جوق درجوق آپ کا کلام معجز نظام سننے کے لئے آتے۔ بعض اوقات شہر کا شہر

[17]Beginnings of Christianity. part 1.vol.I.p.444
[18] Ibid.pp.440-444
[19] Aboth .2. 6ed.Christianity pt.1.vol.1 p.443.

جمع ہوجاتا (مرقس ۱: ۳۲) جب آپ تعلیم دیتے تو" اتنے آدمی جمع" ہوجاتے کہ "دروازہ کے پاس جگہ" بھی نہ رہتی (مرقس ۲: ۲) چونکہ گھر اتنے بڑے جم غفیر کے لئے تنگ ہوتا۔آپ باہر جھیل کے کنارے چلے جاتے تا کہ وہاں تعلیم دیں (مرقس ۲: ۱۳) لیکن بعض اوقات وہاں بھی بھیڑ اس قدر جمع ہوجاتی کہ کھوے سے کھوا چھلتا ۔(لوقا ۸: ۴۵) اورآپ قلت جگہ کے باعث خود کشتی میں بیٹھ کر تعلیم دیتے (مرقس ۳: ۷تا ۹)۔ بعض اوقات بھیڑ ہی کشتیوں میں سوار ہوکر آپ کی تعلیم سے مستفیض ہونے کی خاطر جھیل کے دوسرے کنارے پہنچ جاتی (یوحنا ۶: ۵، ۲۴) اور کئی کئی دن تک آپ کی تعلیم سے فیض حاصل کرتی (مرقس ۸: ۲)ارض مقدس میں صدیوں سے کسی نبی کی آواز سنی نہ گئی تھی (زبور ۷۴: ۹ وغیرہ) پس جائے تعجب نہیں کہ جب خدا کا مرسل برگزیدہ آیا تو ہزاروں اس کا پیغام سننے کےلئے کوسوں پیدل پاجاتے۔ عوام الناس کے نزدیک آپ " ناصرت کے نبی" تھے جو عاموس ، یسعیاہ اوریرمیاہ کی مانند تھے پس گاؤں کے گاؤں آپ کا دیدار حاصل کرنے کےلئے اورآپ کی تعلیم سے بہرہ اندوز ہونے کی خاطر دور دور سے آتے۔ جب آپ دیکھتے کہ عوام الناس بخوشی تمام آپ کے پیغام کوسنتے اور قبول کرتےہیں تو آپ خدا کا شکر بجالاتے اورکہتے" اے باپ آسمان اور زمین کے خداوند میں تیری حمد کرتا ہوں کہ تونے یہ باتیں داناؤں ، اور عقلمندوں سے چھپائیں اوربچوں پر ظاہر کیں"(متی ۱۱: ۲۵) آپ نے ان مفلس اور غمزدہ لوگوں کو جن کے

لئے زندگی دوبھر ہوگئی تھی۔ دعوت دی اور فرمایا " اے محنت اٹھانے والو! اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو سب میرے پاس آؤ۔ میں تم کو آرام دونگا"۔(متی ۱۱: ۲۸)۔

(۳۔)حلقہ ءحواریئن

عوام الناس کو تعلیم دینے کے علاوہ کلمۃ اللہ نے حواریوں کا ایک حلقہ اپنے گرد جمع کرلیا۔ اس حلقہ میں بہت شامل ہوجاتے لیکن سیدنا مسیح نے اس کی تعداد کو بارہ سے بڑھنے نہ دیا(مرقس ۳: ۱۳تا ۱۴)جب ہم آنخداوند کے انتخاب پر نظر کرتے ہیں توہم حیران رہ جاتے ہیں کہ آپ نے اپنے پیغام کی تبلیغ کے لئے کسی عالم یا دولتمند یا ذی اثر اور بارسوخ ہستی کو نہ چنا بلکہ آپ نے جاہلوں ناداروں اور مچھوؤں وغیرہ کو جودنیا کی نظر میں حقیر تھے اس کارِ عظیم کے لئے منتخب فرمایا اور یہ طریقہ کار ہماری نظروں میں عجب ہے کیونکہ جب دنیا دار انسان کسی تحریک کو شروع کرتے ہیں تووہ کسی مقتدر ہستی کی تلاش کرتے ہیں جو اپنے رسوخ سے اس تحریک کوچلاسکے لیکن سیدنا مسیح کا یہ طریقہ نہ تھاآپ نے غریب طبقہ کے بارہ افراد کو اپنے خاص شاگرد بنایا۔ اوران شاگردوں کو کلمۃ اللہ نے خاص طور پر تعلیم دینی شروع کی تاکہ وہ دوسروں کو تعلیم دینے کے قابل ہوسکیں(متی ۱۰: ۷۔۳، مرقس ۶: ۷تا ۱۳۔ لوقا ۱۰: ۱۔۲۰) عوام الناس کو تعلیم دینے کے بعد ان حواریوں کو آپ خاص طورپر تعلیم دیتے اور خلوت میں آپ ان کو اپنے کلماتِ طیبات کا مطلب سمجھاتے(مرقس ۴: ۱، ۳۴)آپ نے رفتہ رفتہ ان کے ذہن کھولے تاکہ وہ موجودہ اور آئندہ واقعات کی روشنی میں آپ کی تعلیم کے مفہوم کو بخوبی سمجھ سکیں ۔ یہ طریقہ کار کرثابت ہوا اور انہی حواریوں میں سے ایک نے آپ کے مسیح موعود اورابن اللہ ہونے کا اقرار کیا۔ انہی حواریوں کو آپ نے اپن زندگی کے آخری ایام میں صلیب کے پیغام کی تعلیم دی (مرقس ۹: ۳۱) اور صلیبی موت کے مفہوم کو سمجھایا۔(مرقس ۱۰: ۱۹۔ ۱۴: ۲۲۔۲۴۔لوقا ۲۴: ۲۵۔ ۲۶۔ رومیوں ۶: ۶)آپ نے ان کے ذہن نشین کردیا کہ ان کوتکالیف اورمصائب کاسامنا کرنا پڑیگا ۔(متی ۵: ۱۱۔ مرقس ۸: ۳۴۔ ۱۳: ۹۔ ۱۳ وغیرہ) غرضیکہ کلمۃ اللہ نے اپنے حواریوں کو جہاں تک ان کی ناقص عقل سمجھ سکتی تھی سمجھایا یا آپ نے ان کو خاص طورپر تعلیم دی تاکہ وہ "قوت سے ملبس" ہوکر یروشلیم اور تمام یہودیہ اورسامریہ میں بلکہ زمین کی انتہا تک" (اعمال الرسل ۱: ۸)آپ کی تعلیم کی اشاعت کرسکیں ۔ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ منجیئی عالمین کی اشاعت انہی گنوار اوردہقانی حواریوں کے ذریعہ اکنافِ عالم میں ہوئی اور یہ آپ کے طریقہ تعلیم کے موثرہونے کا بین ثبوت ہے۔

کلمۃ اللہ کی طرز تعلیم:

کلمۃ اللہ نے لوگوں کو دیگر معلموں کی طرح تعلیم نہ دی۔آپ نے افلاطون یا ارسطو یا شنکر آچاریہ کی مانند توفلسفیانہ کتب تصنیف کیں اور نہ اپنی

تعلیم کو فلسفیانہ لباس پہنایا۔ آپ نے اپنی تعلیم کی بنیاد منطقی قضایا پر نہ رکھی اور نہ ان قضایا کے لئے آپ نے مضبوط دلائل اور بین براہین پیش کیں کیونکہ

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

آپ نے علماء اور حکما کے طبقہ کے ساتھ مناظرہ اور مباحثہ نہ کیا۔ لیکن تاہم آپ کی تعلیم نے دنیا کی کایا پلٹ دی جس نے سماج کے تمام طبقوں کو متاثر کردیا۔ حتیٰ کہ ماہی گیروں اور گنہگار عورتوں تک کے اذہان کھول دیئے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ آپ نے کبھی اپنی تعلیم کا ایک لفظ بھی اپنے دست مبارک سے نہ لکھا۔ لیکن آپ کا کلام گو زبانی تھا پر لازوال تھا۔ آپ جانتے تھے کہ آپ کے مبارک الفاظ لوحِ محفوظ کے الفاظ سے بھی الواح پر زیادہ محفوظ رہینگے اور آپ نے فرمایا **"آسمان اور زمین ٹل جائیں گے لیکن میری باتیں ہر گز نہ ٹلیں گی"**۔ (متی ۲۴: ۳۵)۔

آپ کا طریقہ تعلیم دنیا بھر سے نرالہ تھا۔ آپ نے لوگوں کو تقریباً تیس چھوٹی چھوٹی کہانیوں یا تمثیلوں کے ذریعہ تعلیم دی یہ تمثیلیں نہایت خوبصورتی سے کلمۃ اللہ کی تعلیم کو پتھر کی لکیر کی طرح سادہ لوگوں کے ذہن نشین کردیتی ہیں ان کی سادگی اور لطافت نہایت نازک طور سے آج بھی ہمارے دلوں کو بطرز احسن متاثر کرتی ہے اور کلمۃ اللہ کی زبان معجز بیان نے ان تمثیلوں کو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ وہ آپ ہی اپنی نظیر ہیں ہر ملک اور زمانہ کے لوگوں کے دلوں کو وہ اپنی طرف کھینچتی ہیں اور جاہل و عالم ادنیٰ واعلیٰ ہر طبقہ کے لوگوں کواپیل کرتی ہیں۔

تمثیلیں سیدنا مسیح کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہیں۔ گو آپ سے پہلے اہل یہود تمثیلوں سے ناواقف نہ تھے لیکن آپ اس دنیا میں پہلے شخص تھے جنہوں نے تمثیلوں کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنایا۔ عہد عتیق کی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے حواریوں نے تمثیلوں کے ذریعہ کبھی تعلیم نہ دی۔ تاریخ ہمیں کسی اور شخص کا پتہ نہیں بتاتی جس نے یہ طریقہ استعمال کیا ہو پس صرف کلمۃ اللہ ہی اکیلے مذہبی پیشوا ہیں جنہوں نے اپنی تعلیم تمثیلوں کے ذریعہ دی ہے۔ پس جس طرح آپ کی شخصیت بے نظیر ہے۔ اسی طرح ان کا طریقہ تعلیم بھی لاثانی اور بے عدیل ہے۔

سیدنا مسیح اپنی تمثیلوں میں اکثر ایسی اشیاء کا ذکر کرتے تھے جو عام ہیں اور روزمرہ مشاہدے میں آتی ہیں۔ پس سننے والا نہایت آسانی سے ان کو یاد رکھ سکتا تھا اور ان اشیا کو بار بار دیکھنے سے ان تمثیلوں کی یاد اس کے دل میں ہمیشہ تازہ ہوجاتی تھی۔ سیدنا مسیح کے ہاتھ میں زندگی کی نہایت معمولی اشیاء تمثیلوں کے ذریعہ سبق آموز ہوگئیں۔ ان تمثیلوں کے معانی نہایت مطلب خیز تھے۔ اور ہر شخص جس کے سر میں دماغ اور دماغ میں سمجھ تھی اور جوالٰہی امور کی بابت شوق رکھتا تھا ان تمثیلوں کو عموماً سمجھ سکتا اور بعض اوقات کلمۃ

اللہ خود ان کا مطلب اپنی زبان حقائق ترجمان سے سمجھادیتے تھے۔ (متی ۱۳ باب)۔

تمثیلوں میں تعلیم دینے کا منشا یہ بھی تھا کہ لوگ خدا کی بادشاہت کے امور کی نسبت متجسس ہوں یہ تمثیلیں بادشاہت کے بھیدوں " کو متلاشیوں پر ظاہر کردیتی تھیں ۔ لیکن کاہل لوگ جن کو خدا کے کلام کا شوق نہیں تھا۔ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے۔ یہ بھی اس ازلی قانون کی مثال ہے کہ جس کے پاس ہے اسے دیا جائیگا ۔ لیکن جس کے پاس نہیں ہے اس سے وہ بھی جو اس کے پاس ہے اسے لے لیا جائیگا"۔(متی ۱۳: ۱۲) قسم دوم کی جماعت کو یہ موقع تھا کہ وہ تعلیم حاصل کرسکیں ۔ لیکن وہ سمجھنے کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اس صداقت کو سیدنا مسیح نے ان الفاظ میں ادا کیا۔ آپ نے فرمایا۔ "وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے اور نہیں سمجھتے۔ اس اُمت کے دل پر چربی چھا گئی ہے اوروہ کانوں سے اونچا سنتے ہیں اور انہوں نے اپنی آنکھیں بند کرلی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آنکھوں سے معلوم کریں اور کانوں سے سنیں اور دل سے سمجھیں اور رجوع لائیں اور میں ان کو شفا بخشوں"۔(متی ۱۳: ۱۳تا ۱۵)۔ قسم اول کے اشخاص خدا کی بادشاہت کے اُمور کی تلاش کرتے ہیں اوران کو" آسمان کی بادشاہی کے بھیدوں کی سمجھ دی گئی ہے"۔(متی ۱۳: ۱۱)سیدنا مسیح ان کی نسبت فرماتے ہیں"مبارک ہیں ان کی آنکھیں کیونکہ وہ دیکھتی ہیں ان کے کان اس لئے کہ وہ سنتے ہیں"(متی ۱۳: ۱۶)۔

کلمۃ اللہ کی تمثیلیں ایک اور امر اہم منکشف کرتی ہیں کہ اشیائے فطرت اور روحانی امور میں تطبیق ہے آپ سے پہلے کسی شخص نے اس حقیقت کو نہ پایا آپ پہلے معلم تھے جن کی تعلیم سے یہ معلوم ہوا کہ روحانی مزاج اشخاص کے لئے تمام خلقت ایک تمثیل ہے۔ جو خالق کو لاپروا لوگوں سے چھپاتی ہے۔ مگر بابصیرت لوگوں پر ظاہر کرتی ہے۔ کلمۃ اللہ اسی خلقت کی معمولی اشیا کو ان رموز کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال فرماتے ہیں جو بنائے عالم کے وقت سے پوشیدہ رہی ہیں(متی ۱۳: ۳۵) جرمن فلاسفر شلینگ (Shellong) کہتا ہے کہ فطرت ایک تمثیل ہے اور تاریخ اس کی ایک تاویل ہے۔ کلمۃ اللہ کے نزدیک فطرت اور تاریخ دونوں تمثیلیں ہیں اور خدا کی بادشاہت ان تمثیل کی تاویل ہے۔عبادتخانوں میں منجئی عالمین عہد عتیق کے صحیفوں کی تشریح فرماتے تھے ۔لیکن تمثیلوں میں آپ نے صحیفہ فطرت کی تاویل فرمائی۔ اور دونوں قسم کے صحیفوں سے روحانی حقائق خلق اللہ پر ظاہر فرمادئیے۔

(۵۔) کلمۃ اللہ کے کلام کی فصاحت وبلاغت

کلمۃ اللہ کی طرز تعلیم میں ایک اور بات قابل غور ہے آپ نے عبرانی نظم کے طریقہ کو اختیار فرمایا جو عہد عتیق کے صحف انبیاء اور مزامیر میں موجود ہے کلمۃ اللہ کا کلامِ معجز نظام مختلف صنعتوں سے بھرا پڑا ہے اور فصاحت وبلاغت سے پُر ہے۔ جب ہمارے اردو ترجمہ میں اس کا لطف موجود ہے تو آرامی زبان میں اس کا لطف دوبالاہوگا۔

بعض اوقات ایک ہی خیال کو دو مختلف شکلوں میں دو مصرعوں میں ادا کیا گیاہے۔ مثلاً

جومیری طرف نہیں وہ میرے خلاف ہے اور

جو میرے ساتھ جمع نہیں کرتا بکھیرتا ہے۔

(لوقا ۱۱: ۲۳)۔ یا

تیرا یہ بھائی مردہ تھا اب زندہ ہوا

کھویاہوا تھا، اب ملاہے۔

(لوقا ۱۵: ۳۲)

بعض اوقات صنعت تضاد کا استعمال کیا گیا ہے۔ملاحظہ ہو

جو کوئی اپنی جان بچائیگا وہ اسے کھوئیگا

جو کوئی میرے اور انجیل کے واسطے اپنی جان کھوئیگا۔ وہ اسے بچائیگا۔

(مرقس ۸: ۲۵)۔

بعض اوقات دوسرے مصرع میں پہلے کی تشریح کی گئی ہے۔ مثلاً

زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو

کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی جو آسمان پر ہے (متی ۲۳: ۹)۔

بعض اوقات صنعت ردالعجزالی الصدر استعمال کی گئی ہے یعنی پہلے مصرع کے آخری حصہ کو دوسرے مصرع کے شروع میں دہرایا گیا ہے اوراس میں کچھ ایزاد بھی کیا گیاہے۔ ملاحظہ ہو۔

جو تم کو قبول کرتاہے وہ مجھے قبول کرتاہے

جومجھے قبول کرتاہے وہ میرے بھیجنے والے کو قبول کرتاہے۔

(متی ۱۰: ۴۰)۔

بعض اوقات صنعت تمثیل کا استعمال ہوا ہے اورسلیمان کے امثال کے طرز پرامثال فرماتےہیں۔ ملاحظہ ہو۔

جو تمہارے خلاف نہیں وہ تمہاری طرف ہے (لوقا ۹: ۵۰)۔

تم زمین کے نمک ہو۔ (متی ۵: ۱۳)۔

تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کرسکتے(متی ۶: ۲۴)۔

عبرانی کتب مقدسہ میں بہت سے فقرے ایسے ہیں جو اس طرز پر ڈھالے گئےہیں۔

"-----نہ------بلکہ-----"

یہ صفت انجیل شریف میں بھی پائی جاتی ہے۔ملاحظہ ہو:

فانی خوراک کے لئے محنت نہ کرو، بلکہ اس خوراک کے لئے جو ابدی زندگی کے لئے قائم رہتی ہے۔(یوحنا ۶: ۲۷)۔

چاروں انجیلوں میں ایسی آیات کی تعداد دو صد سے زیادہ ہے بعض اوقات کلمۃ اللہ استعارہ اور تشبیہ کا استعمال فرماتےہیں مثلاً:

" اے یروشلیم کتنی ہی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کرلیتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے ، لڑکوں کو جمع کرلوں ۔مگر تم نے نہ چاہا"۔

بعض اوقات صنعت حسن تعلیل کا استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

" اگر تم آدمیوں کے قصور معاف کروگے تو تمہارا آسمانی باپ (پروردگار) بھی تم کو معاف کریگا۔ اگر تم آدمیوں کے قصور معاف نہ کرو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تمہارے قصور معاف نہ کریگا(متی ۶: ۱۴تا ۱۵)۔

اختصار مانع ہے ورنہ کلمۃ اللہ کا کلام معجز نظام مختلف صنائع اور بدائع سے پُر ہے آپ کا کلام اس لحاظ سے ایک معجزہ ہے۔ اس میں ایک مقام ایسا نہ ملیگا جو بے جوڑ یا خامی عبارت سے پُر ہو یا جس میں الم غلم بیر گھٹلی الفاظ حشویہ بھرے ہوئے ہوں یا بے معنی تکرار ہو۔ یہ ایک بحر ذخار ہے جس میں سے گذشتہ دوہزار سال سے غوصانِ بحر حقیقت نے نادر موتی نکالے ہیں۔آپ کے ہر لفظ میں نکتہ ہے ہر فقرہ اعجازی ہے آپ کا کلام فصاحت وبلاغت اور نظم وترتیب کے لحاظ سے یگانہ روزگار ہے۔

کلمۃ اللہ کا کلام ایسا تھا کہ جس نے ایک دفعہ سن لیا وہ کبھی بھول نہ سکا کون شخص ہے جو اپنی زندگی میں مندرجہ بالا انجیلی فقروں میں سے کسی ایک کو سن لے اور بھول سکے؟فقرات ایسے برجستہ اور چست ہیں کہ فوراً ذہن نشین ہوجاتے ہیں۔ وہ ایسے پُرمعنے ہیں کہ درُنایاب ہیں اس میں سادہ ترین الفاظ ایک لڑی میں پروئے گئے ہیں۔ اوران میں انتہا درجہ کا جوش اور اثر پیدا ہوگیا ہے۔ ان کی عدیم المثال کامیابی ان کے اثرریز ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

(۶۔) کلمۃ اللہ کی جدت طبع

کلمۃ اللہ کی جدت طبع صرف اسی سے ظاہر نہیں کہ آپ عوام الناس کو تعلیم دیتے تھے جن کو دیگر ربی حقیر جانتے تھے۔آپ کی جدت طبع آپ کی لاثانی اوربے نظیر طرز تعلیم پر ہی منحصر نہیں بلکہ اس کا تمام انحصار آپ کی مخصوص تعلیم پر ہے۔ بعض مخالفین یہودی کتب سے آپ کی تعلیم کی نظیریں پیش کرتے ہیں مثلاً آنجہانی مرزا صاحب قادیانی کہتے ہیں کہ مسیح نے یہود کی کتب طالمود سے تعلیم چوری کرکے لوگوں پر ظاہر کیا کہ یہ میری تعلیم ہے ۔(ضمیمہ انجام آتھم صفحہ ۶)لیکن یہودی عالم ڈاکٹر مانٹی فیوری اس امر کی نسبت لکھتا[20] کہ یہ نظیریں پیش نہیں کی جاسکتیں اوراس کے دو سبب ہیں اول یہ کہ ان یہودی کتب کا ایک بہت بڑا حصہ پہلی صدی مسیحی کے بعد لکھا گیا۔ جب انجیلیں لوگوں کے ہاتھوں میں موجود تھیں۔ دوم یہ ان یہودی کتب کااب تک کافی مطالعہ نہیں کیا گیا اور درحقیقت وہی نظیریں زیربحث ہیں جو پیش کی جاتی ہیں "۔ پس جب یہودی کتب مابعد کے زمانہ میں تصنیف ہوئیں تو مقدم کلمۃ اللہ ٹھہرے ۔ لیکن اگر ہم تقدیم وتاخیر کے سوال کو اڑادیں اور بفرض محال اگر

[20] Beginnings of Christianity pt.1.vol.1.p.443

مخالفین یہودی کتب سے نظیریں پیش بھی کرسکیں تو اس سے سیدنا مسیح کی جدت پر حروف نہیں آسکتا کیونکہ اگر یہودی کتب کے انباروں کے انبار میں سے چند ایک فقرات درُنایاب کی طرح نکل بھی آئیں۔ تو وہ کلمتہ اللہ کی تعلیم کی درحقیقت کوئی نظیر نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ یہ فقرات ہزاروں ربیوں کی کتب کے انباروں سے نکالے جائینگے۔ لیکن صرف کلمتہ اللہ اکیلے معلم ہیں جن کے تمام اقوال اگر ایک جگہ جمع کئے جائیں تو بمشکل پچاس صفحوں کے قریب ہونگے ان اقوال میں ایک فقرہ بھی ایسا نہیں ہے جو دریائے معرفت کا درُنایاب نہ ہو۔ جرمن نقاد ولہاسن (WELLHAUSEN) کہتاہے کہ " یہودی علماء کا خیال ہے کہ مسیح کے اقوال طالمود میں پائے جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے لیکن انجیل میں ان کے علاوہ بیسیوں اقوال ہیں جو طالمود میں نہیں ملتے۔ مسیح پہلا شخص تھا جس نے وہ کچھ کیا جو کسی نہ کیا تھا۔ اس نے یہودی علم فقہ اور قیود شرعیہ کے کوڑا کرکٹ میں سے ازلی اصول دریافت کئے علاوہ ازیں متعدد اقوال ایسے بھی ہیں جو انجیل میں سے اخذ کرکے طالمود میں ڈال دئے گئے ہیں۔ اب وہ اقوال یہودی اقوال ہونے کا باطل دعویٰ کرتے[21] ہیں۔ ربیوں کی تعلیم میں اخلاق کے گیہوں کے دانے موجود تھے لیکن وہاں جھاڑیوں کے بے شمار کانٹے بھی تھے اور جھاڑیوں نے بڑھ کر گیہوں کے دانوں کو دبالیا تھا کلمتہ اللہ نے جھاڑیوں کو جمع کرکے جلانے کے واسطے ان کے گٹھے باندھ دئے اور گیہوں کو کھتے میں جمع کرلیا۔

علاوہ ازیں سیدنا مسیح کی طرفہ تعلیم کی جدت صرف آپ کے مختلف اقوال میں ہی نہیں بلکہ سالم تعلیم ہے۔ تعلیم کی نظیر تب ہی ثابت ہوسکتی ہے اگرہم یہودی ربیوں کی سالم تعلیم اور کلمتہ اللہ کی سالم تعلیم کولیں اور ان کا مقابلہ کرکے ان کی نظیر ثابت کریں۔ لیکن یہ کوئی انسان نہیں کرسکتا کیونکہ یہودی ربیوں کی تعلیم کی روح اور کلمتہ اللہ کی تعلیم کی روح میں بعد المشرقین ہے دونوں کے زاویہ نگاہ میں اختلاف ہے۔ دونوں کی فضا الگ ہے دونوں کی خصوصیات جدا ہیں۔ آپ کے جاہل اور گنوار سامعین بھی بول اٹھے کہ " وہ ان کو فقیہوں کی طرح نہیں بلکہ صاحب اختیار کی طرح تعلیم دیتا تھا" (مرقس ۱ : ۲۲)۔ ان دونوں میں کسی طرح کا تعلق ہی نہیں تھا وہ بچپن سے فقیہا کی تعلیم سنتے آئے تھے لیکن ان کے کانوں نے کلمتہ اللہ کی سی تعلیم نہیں سنی تھی۔"پس سب لوگ حیراب ہوئے " اورکہنے لگے " یہ تو نئی تعلیم ہے"(مرقس ۱ : ۲۷) کلمتہ اللہ کی تعلیم نہ فریسیوں کی سی تھی نہ صدوقیوں کی سی تھی آپ کے خیالات نہ قوم پرستوں کے سے تھے اور نہ ہیردویسیوں کے سے تھے۔ آپ کے الفاظ میں نہ تو عہد عتیق کا عنصر غالب تھ اور نہ ان پر یونانیت کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ آپ نے اخلاق کوایک نئے اصل اصول پر قائم کیا تھا۔ آپ کی تعلیم نئی تھی اوراس کا سبب بھی آپ نے بتادیا۔ آپ نے

---

[21] Dr.Burney.The Poetry of Our Lord. Also Dalman The Words of Jesus

فرمایا " میری تعلیم میری نہیں بلکہ میرے بھیجنے والے کی ہے"(یوحنا ۷: ۱۶)پس ہر پہلو سے آپ کی طبع زاد تعلیم بے نظیر اور لاثانی ہے۔

کلمتہ اللہ اور دیگر مذاہب کے بانی

کلمتہ اللہ کی تعلیم میں اور دیگر مذہبی پیشواؤں کی تعلیم میں ایک عظیم فرق بھی ہے کہ دیگر انبیاء اور مذہبی پیشوا اپنے مذہب کے جزو لاینفک نہیں تھے مثلاً اسلامی تعلیم کو معلوم کرنے کے لئے ضروری نہیں کہ پیغمبر عرب کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے ۔ خود رسول عربی نے اپنے اقوال اور الہیٰ ارشادات میں تمیز کی ہے لیکن کلمتہ اللہ کی تعلیم کا یہ حال نہیں ۔ کلمتہ اللہ کی زندگی ، موت فتحیاب قیامت کے بغیر ہم آپ کی تعلیم کا مفہوم سمجھ ہی نہیں سکتے ۔ آپ کی زندگی کے واقعات آپ کی تعلیم پر پوری روشنی ڈالتے ہیں ۔ اور سیدنا مسیح کا کامل اور اکمل نمونہ اس تعلیم کی بہترین مثال ہے۔ پس کسی حالت میں بھی ہم آپ کی تعلیم کو آپ کی زندگی سے الگ نہیں کرسکتے ۔ کیونکہ آپ کی زندگی میں تعلیم موجود ہے ۔ جس طرح آپ کی تعلیم میں زندگی موجود ہے۔ یہ دونوں درحقیقت ایک ہی ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر مطالعہ کرنا درحقیقت اس پہلو پر ظلم کرنا ہے۔ لیکن چونکہ اس رسالہ میں ہمارا موضوع صرف کلمتہ اللہ کی تعلیم ہے لہذا جہاں تک ممکن ہوسکتا ہے ہم صرف آپ کی تعلیم کا ہی ذکر کریں گے۔

ایک اور پہلو سے بھی مجرد تعلیم پر غور کرنا اس پر ظلم کرنا ہے۔ کلمتہ اللہ کے زریں اقوال مختلف موقعوں پر بولے گئے تھے۔ ان کی " شان نزول" کو نظر انداز کرکے ان کو ایک نظام میں منسلک کرکے مختلف عنوانوں کے تحت ان کا مطالعہ کرنے سے ان کا وہ لطف جاتا رہتا ہے جو سامعین کو حاصل ہوتا تھا[22]۔ کلمتہ اللہ کا دل معرفت کا دریا تھا ۔ آپ نے " دل کے اچھے خزانے سے اچھی چیزیں نکالیں"(لوقا ۶ : ۴۵) آپ کے اقوال بجلی کی کوند کی مانند ہیں جو بدی کی تاریکی کو دور کرکے اکناف عالم کو روشن کردیتے ہیں۔ لیکن ان اقوال کو ایک ڈھانچہ میں ڈال کر ان کا مطالعہ کرنا ان پر ظلم کرنا ہے۔ آپ کا طرزِ تعلیم فلاسفہ کا سا نہ تھا۔ آپ نے دیدہ ودانستہ ایسی طرزِ تعلیم کو رد کردیا جو فلاسفہ اور ربیوں کی تھی۔ وہ اپنے اقوال کو ایک نظام میں ڈھال کر مختلف عنوانوں کے تحت اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے تھے۔ کلمتہ اللہ بھی اگر چاہتے تو ایسا کرسکتے تھے لیکن آپ نے یہ طریقہ پسند نہ فرمایا۔ لیکن یہی طریقہ ہر مصنف کو مجبوراً استعمال کرنا پڑتا ہے۔ پس چونکہ ہم ایسا طریقہ استعمال کرتے ہیں جو کلمتہ اللہ نے دیدہ دانستہ رد کردیا تھا ۔ قدرتاً ہم آپ کے الفاظ اور اقوال پر جبر عظیم کرتے ہیں[23] کلمتہ اللہ کے الفاظ میں ہم " نئی مے کو پرانی مشکوں میں بھرتے ہیں ۔ اور" کورے کپڑے کا پیوند پرانی پوشاک میں " لگاتے ہیں(متی ۹: ۱۶ تا ۱۷)۔

---

[22] Montefiore Religious Teachings of Jesus 10-11.

[23] Quoted by Rashdall in Conscience and Christ. P.93 note

(۸-) زمانہ تعلیم

کلمۃ اللہ نے کہاں کس جگہ اور کب تعلیم دی ؟ ان سوالات کا تعلق زبان ومکان کے تقرر کے ساتھ ہے اور کل علماء اس پر متفق نہیں تاہم علماء کی ایک کثیر تعداد ذیل کی تاریخوں پر قریباً متفق ہے۔

۱۔ کلمۃ اللہ کا ظہور قدسی۔ یعنی سن پیدائش ۵ قبل مسیح۔

۲۔ کلمۃ اللہ کا اصطباغ پانا۔ موسم گرما ۲۶ء۔

۳۔ کلمۃ اللہ کی خدمت کے ابتدائی واقعات۔ یعنی یوحنا اصطباغی کی آمد سے لے کر یروشلیم میں وردد مسعود تک۔ از موسم گرما ۲۶ء تا روز عید فسح ۱۱ اپریل ۲۷ء۔

۴۔ یہودیہ میں ابتدائی خدمت۔ یعنی یروشلیم میں وارد ہونے سے لے کر گلیل میں مراجعت فرمانے تک۔ ازروز عید فسح ۱۱ اپریل ۲۷ء تا دسمبر ۲۷ء۔

۵۔ گلیلی خدمت کا پہلا دور۔ یعنی گلیل میں مراجعت کرنے سے لے کر بارہ حوارئین کے انتخاب تک۔ از دسمبر ۲۷ء تا ابتدائے موسم گرما ۲۸ء۔

۶۔ گلیلی خدمت کا دوسرا دور۔ یعنی حوارئین کے انتخاب سے لے کر شمالی گلیل میں خدمت گزین ہونے تک از ابتدائے موسم گرما ۲۸ء تا روز عیدِ فسح ۱۸ اپریل ۲۹ء۔

۷۔ گلیلی خدمت کا تیسرا دور۔ یعنی شمالی گلیل میں خلوتً گزیں ہونے سے لے کر یروشلیم کی طرف روانہ ہونے تک۔ ازروز عید فسح ۱۸ اپریل ۲۹ء تا نومبر ۲۹ء۔

۸۔ پیریا میں خدمت۔ یعنی گلیل سے آخری دفعہ روانہ ہونے سے لے کر یروشلیم میں آخری دفعہ وارد ہونے تک۔ از نومبر ۲۹ء تا عید فسح سے پہلا اتوار مطابق ۲ اپریل ۳۰ء۔

۹۔ مقدس ہفتہ۔ یعنی یروشلیم میں وارد ہونے سے لے کر ظفریاب قیامت تک ازاتوار ۲ اپریل تا اتوار ۹ اپریل ۳۰ء۔

۱۰۔ آخری چالیس ایام۔ یعنی کلمۃ اللہ کی ظفریاب قیامت سے لے کر صعود آسمانی تک۔ ازاتوار ۹ اپریل تا جمعرات ۱۸ مئی ۳۰ء۔

مندرجہ بالاواقعات اناجیل اربعہ میں ذیل کے مقامات میں درج ہیں۔

اول۔ کلمۃ اللہ ظہور قدسی:

(ا) تمہید۔ متی ۱: ۱تا ۱۷۔ لوقا ۱: ۱تا ۴، ۳: ۲۳۔ ۳۸۔ یوحنا ۱: ۱۔۱۸۔

ب۔ فرشتہ کا آنا۔ لوقا ۱: ۵۰تا ۵۶۔ متی ۱: ۱۸تا ۲۵۔

ج۔ پیدائش۔ متی ۱: ۱۸تا ۲۵۔ لوقا ۱: ۵۷تا ۲: ۲۰۔

د۔ طفولیت۔ متی ۲: ۱۔۲۳۔ لوقا ۲: ۲۱۔ ۳۹۔

ہ۔ ناصرت کی زندگی۔ لوقا ۲: ۳۹تا ۵۲۔

دوم- کلمۃ اللہ کا اصطباغ پانا:

متی ۳: ۱ تا ۴- ۱۱-مرقس ۱: ۱ تا ۱۳-لوقا ۳: ۱ تا ۴: ۱۳-

سوم- کلمۃ اللہ کی خدمت کے ابتدائی واقعات:

یوحنا ۱: ۱۹ تا ۲: ۱۲-

چہارم- یہودیہ میں ابتدائی خدمت

ا- یروشلیم میں مسیح کے کام کی ابتدا- یوحنا ۲: ۱۳ تا ۳: ۲۱-

ب- یہودیہ میں منادی اور بپتسمے- یوحنا ۳: ۲۲ تا ۲۶-

ج- سامریہ میں دو دن کی خدمت- متی ۴: ۱۲-مرقس ۱: ۱۴- یوحنا ۴: ۱-۴۲-

پنجم- گلیلی خدمت کا پہلا دور

ا- گلیلی خدمت کی ابتدا- متی ۴: ۱۲-۱۷-مرقس ۱: ۱۴-۱۵-لوقا ۴: ۱۴-۳۱- یوحنا ۴: ۴۳ تا ۵۴-

ب- چار حواریوں کی بلاہٹ اور پہلا مشنری سفر (متی ۴: ۱-۲۳، ۸: ۱، ۴، ۱۴، ۱۷-مرقس ۱: ۱۶-۴۵-لوقا ۴: ۳۱-۴۴، ۵: ۱-۱۶-

ج- فقیہوں اور فریسیوں کی دشمنی- متی ۹: ۱-۱۷، ۱۲: ۱-۴-مرقس ۲: ۱-۳-۳: ۶-

ششم- گلیلی خدمت کا دوسرا دور:

ا- بادشاہت کی تنظیم- متی ۴: ۲۳ تا ۸: ۱-۱۰: ۲-۴-۱۲: ۱۵-مرقس ۳: ۷-۱۹-لوقا ۶: ۱۷-۴۹-

ب- دوسرا مشنری سفر- متی ۸: ۵-۱۳، ۱۱: ۲-۳۰-لوقا ۷: ۱ تا ۸: ۳-

ج- گلیل کی جھیل کے کنارے تعلیم- متی ۱۲: ۲۲ تا ۱۳: ۵۳-مرقس ۳: ۱۹ تا ۴: ۳۴-لوقا ۸: ۴-۲۱-

د- جھیل کے کنارے کے معجزات- متی ۸: ۲۳ تا ۹: ۳۴-مرقس ۴: ۳۵ تا ۵: ۴۳-لوقا ۸: ۲۲ تا ۵۱-

ہ- تیسرا مشنری سفر- متی ۹: ۳۵ تا ۱۱: ۱، ۱۳: ۵۴-۵۸-۱۴: ۱-۱۲-مرقس ۶: ۱-۲۹-لوقا ۹: ۱-۷-

و- کفر نحوم کے واقعات- متی ۱۴: ۱۳ تا ۱۵: ۲۰-مرقس ۶: ۳۰ تا ۷: ۲۳-لوقا ۹: ۱۰ تا ۱۷-یوحنا ۶: ۱ تا ۱۷-

ہفتم- گلیلی خدمت کا تیسرا دور

ا- خلو گزینی کے لئے پہلا سفر- متی ۱۵: ۲۱-۳۱-مرقس ۷: ۲۴-۳۷-

ب- گلیل کی جھیل کو واپسی- متی ۱۵: ۳۲ تا ۱۶: ۱۲-مرقس ۸: ۱ تا ۲۶-

ج- خلوگ گزینی کے لئے دوسرا سفر- متی ۱۶: ۱۳ تا ۱۷: ۲۳-مرقس ۸: ۲۷ تا ۹: ۳۲-لوقا ۹: ۱۸-۴۵-

د- کفر نحوم میں آمد- متی ۱۷: ۲۴- ۲۷، و۱۸ باب - مرقس ۹: ۳۳-
۵۰- لوقا ۹: ۴۶- ۵۰-

ہ- یروشلیم میں موسم خزاں میں آمد- یوحنا ۷: ۱ تا ۸: ۵۹-

ہشتم- پیریا میں خدمت:

ا- گلیل سے روانگی کے وقت سے لے کر عید تک- متی ۸: ۱۸- ۲۲- ۱۹:
۱- ۲- مرقس ۱۰: ۱- لوقا ۹: ۵۱تا ۱۰: ۴۲- یوحنا ۹: ۱تا ۱۰:
۴۲-

ب- عید کے وقت سے افرائیم میں خلوت گزینی تک- لوقا ۱۱: ۱تا ۱۷:
۱۰ و یوحنا ۱۱: ۱-۵۴-

ج- افرائیم سے خلو گزینی سے لے کر یروشلیم میں وارد ہونے تک- متی ۱۹:
۳تا ۲۰: ۳۴، ۲۶: ۶- ۱۳- مرقس ۱۰: ۲تا ۵۲، ۱۴: ۳-۹- لوقا
۱۷: ۱۱تا ۱۹: ۲۸- یوحنا ۱۱: ۵۵تا ۱۲: ۱۱-

نہم - مقدس ہفتہ:

یک شنبہ: متی ۲۱: ۱تا ۱۱- مرقس ۱۱: ۱تا ۱۱- لوقا ۱۹:
۲۹تا ۴۴- یوحنا ۱۲: ۱۲تا ۱۹-

دوشنبہ- متی ۲۱: ۱۲تا ۲۲- مرقس ۱۱: ۱۲- ۱۹- لوقا ۱۹:
۴۵تا ۴۸-

سہ شنبہ : متی ۲۱: ۲۰تا ۲۶- ۱۶: مرقس ۱۱: ۲۰تا ۱۴:
۱۱- لوقا ۲۰: ۱تا ۲۲- ۶- یوحنا ۱۲: ۲۰- ۵۰-

چہار شنبہ-

پنج شنبہ: متی ۲۶: ۱۷تا ۳۵- مرقس ۱۴: ۱۲تا ۳۱- لوقا
۲۲: ۷تا ۳۸- یوحنا ۱۳ باب تا آخر ۱۷ باب-

جمعہ - متی ۲۶: ۳۶تا ۲۷: ۶۱- مرقس ۱۴: ۳۲تا ۱۵:
۴۷- لوقا ۲۲: ۳۹تا ۲۳: ۵۶- یوحنا ۱۸: ۱تا ۱۹: ۴۲-

شنبہ: متی ۲۷: ۶۲تا ۶۶-

دہم- آخری چالیس ایام-

ا- مسیح کی ظفریاب قیامت- متی ۲۸: ۱ تا ۱۵- مرقس ۱۶: ۱تا
۴- لوقا ۲۳: ۵۶تا ۲۴: ۴۳- یوحنا ۲۰: ۱تا ۲۵-

ب- سیدنا مسیح کا شاگردوں کو دوبارہ دکھائی دینا اور صعود آسمان- یوحنا
۲۰: ۲۶تا ۲۱: ۲۴- متی ۲۸: ۱۶- ۲۰- مرقس ۱۶: ۱۵تا ۲۰-
لوقا ۲۳: ۴۴تا ۵۳-

ج- تتمہ- یوحنا ۲۰: ۳۰، ۳۱، ۲۱: ۲۵-

باب اوّل

حقوق اللہ

فصل اوّل۔ تعلیمِ مسیح دربارہ ذاتِ الہیٰ

(۱)

اہل یہود کے لئے احکامِ عشرہ میں پہلا حکم یہ تھا کہ ۔" کہ میرے حضور تو غیر معبود کو نہ ماننا"(توریت شریف کتاب خروج ۲۰: ۳) اوائل زمانہ میں اہلِ یہود اس حکم کا مطلب یہ سمجھے کہ اس حکم سے دیگر اقوام وممالک کے معبودوں کی عبادت ممنوع ہے۔لیکن ان کے وجود کی نفی نہیں ہوتی۔ بلکہ جس طرح ان کا معبود یہواہ حقیقی وجود رکھتاہے اوران کی قوم یہود پر حکمران ہے اسی طرح دیگر ممالک کے معبود حقیقی وجود رکھتے ہیں۔ اور ان اقوام پر حکمران ہیں جو ان کی پرستش کرتی ہیں ۔ صرف اہلِ یہود کو ان غیر معبودوں کی پرستش سے منع کیا گیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح ان کے معبود "یہواوہ" نے ان کوملک کنعان کی سرزمین عطا کی ہے اسی طرح دیگر ممالک کے معبودوں نے اپنی اقوام کو ان کے ممالک عطا کئے ہیں۔ معبودوں کی حکمرانی اُن کے پرستاروں کے ملک کی سرحد تک محدود سمجھی جاتی تھی ۔ لہذا ایک ملک کے معبود کی پرستش اس کے حدود کے باہر دوسرے ملک کی سرزمین میں نہیں ہوسکتی تھی(بائبل شریف کتابِ قضات ۱۱: ۲۴۔ ۱۔سیموئیل ۲۶: ۱۹ ۔ ۲سلاطین ۵: ۱۸ وغیرہ)۔

سیدنا مسیح سے آٹھ صدیاں پیشتر انبیائے عظام مثلاً یسعیاہ ، ہوسیع عاموس اورمیکاہ نے اہل یہود کو یہ تعلیم دی تھی کہ ان کا خدا یہوداہ اکیلا واحد حقیقی برحق اور لاشریک خداہےاور تمام بت اور دیگر ممالک کے معبود باطل ہیں۔ جو کوئی ہستی نہیں رکھتے ۔ یہواوہ دانائے مطلق اورحاضروناظر خالق کون ومکان ہے جواپنی خلقت کا پروردگار ہے وہ قادر مطلق لامحدود ازلی الرحمٰن الرحیم ہے۔جوہمارے گناہوں کا معاف کرتاہے ۔ چندایک مقامات میں خدا کوباپ کا نام بھی دیا گیاہے(زبور شریف ۶۸:۵آیت، ملاکی ۱: ۶، ۲: ۱۰)۔

اہل یہود خدا کے نام یہواوہ کو اسم اعظم اور مقدس ترین نام خیال کرتے تھے۔وہ" یہوواہ" نام منہ سے نکالنے سے ڈرتے تھے ۔ لہذا وہ اس نام کا بہت کم استعمال کرتے تھے۔ پس ان میں خداکے لئے چند دیگر نام مروج تھے۔ خدا کوعموماً "ستودہ" (مرقس ۱۴: ۶۱)یا حق تعالیٰ (زبور ۹۱: ۱)یا"آسمان"(یوحنا ۳: ۲۷)یا محض " نام" یا "قدرت" (مرقس ۱۴: ۶۲ کے ناموں سے خطاب کیا جاتا تھا۔

یہودی ربیوں نے خدا کی ہستی کوایسا بلند وبالااور بعید بنادیا تھا۔ کہ خدا اوراس کی خلقت میں ایک بڑی خلیج حائل ہو گئی تھی۔سیدنا مسیح نے اس خلیج کو ہٹادیا اور یہ تعلیم دی کہ گو خدا انسان سے بلند وبالاہے تاہم وہ ایک ہستی ہے

جس کی ذات ہی محبت ہے۔ گو سید نا مسیح خدا کی بادشاہت کی منادی کرتے تھے تاہم آپ نے خدا کا تصور سیاسی اور پولٹیکل حلقوں سے اخذ نہ کیا۔ آپ نے خدا کو کبھی بادشاہ نہ کہا۔ آپ کے نزدیک خدا کوئی سلیمان بادشاہ کی طرح نہ تھا جواپنی ساری شان وشوکت سے آسمانی تخت پر بیٹھا[24] ہے۔ آپ نے خدا کے تصور کو خاندانی زندگی سے اخذ کیا۔ آپ کی تعلیم کے رگ وریشہ میں خدا کی محبت کا تصور موجود ہے ۔ خدا کے واسطے" باپ" کا نام آپ کو نہایت محبوب تھا۔ چنانچہ آپ ہمیشہ خدا کو" باپ" (متی ۱۱: ۲۵۔ مرقس ۱۳: ۳۲) وغیرہ" میرا باپ" متی ۷: ۲۱۔ ۱۰: ۳۲۔ لوقا ۲: ۴۹۔ متی ۱۶: ۱۷تا ۱۸۔ ۱۰: ۲۶: ۴۲ وغیرہ "میرا آسمانی باپ" (متی ۱۸: ۳۵)"ہمارا باپ "(متی ۶: ۹)۔ کے نام سے کرتے تھے چنانچہ صرف" پہاڑی وعظ" میں یہ خطاب ۱۷ دفعہ وارد ہواہے سیدنا مسیح کی زبان معجز بیان پر یہ لفظ نہایت مطلب خیز ہوجاتا ہے اور ایسے معنی اختیار کرلیتا ہے جو انبیائے سابقین کے وہم وگمان میں بھی نہ آئے تھے ۔ جس طرح عہد عتیق خدا کے لئے لفظ" یہوواہ" خاص نام ہے اسی طرح اناجیل اربعہ خدا کے لئے لفظ" باپ" خاص طورپر استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظ کے ذریعہ ذاتِ الہیٰ کا ایک نیا انکشاف ہم پر ہوا ہے اور یہ انکشاف ذاتِ الہیٰ کا کامل اوراکمل مکاشفہ ہے۔

سیدنا مسیح کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا کی ذات محبت ہے۔ تمام صفات اس اصول کے تحت کردی گئی ہیں اگر خدائے قادر مطلق اور اکبر وعلیم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی محبت قادر واکبر اور علیم ہے جو تمام شیطانی روکاوٹوں پر غالب آتی ہے (متی ۱۰: ۲۸تا ۳۱) اگر خدا لامحدود اورازلی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی محبت لامحدود اور ازلی ہے اگر خدا وفادار ہے تو اس کی محبت وفادار اورلاتبدیل ہے اگر خدا حاضر وناظر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسکی محبت ہر جگہ حاضر وناضر ہے اگر وہ کامل ہے تو اس کی محبت کامل ہے اگرخدا رحمنٰ الرحیم، کریم غفار اور شفقت میں غنی ہے تو محض اپنی محبت کی وجہ سے ہے اگر خدا غیور ہے تو اس کی غیرت محبت کی وجہ سے جوش زن ہے حتیٰ کہ خدا کا غضب بھی آتش محبت کی چنگاریاں ہیں پس جب خدا محبت ہے توہمارا بھی مقدم اوراولین فرض یہ ہے کہ " ہم خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اوراپنی ساری جان اوراپنی ساری عقل اوراپنی ساری طاقت سے محبت" رکھیں ۔(مرقس ۱۲: ۳۰)۔

کلمتہ اللہ نے خدا کی ذات کی نسبت ایک امرہم پر ظاہر فرمایاہے۔ جو زمانہ سلف میں لوگوں کو معلوم نہ تھا۔ آپ نے یہ تعلیم دی ہے کہ محبت کا جوہرایثار ہے ۔چونکہ خدا بنی نوع انسان کوپیار کرتاہے اس لئے اس کی محبت ہر طرح کا ایثار کرنے کےلئے تیار ہے"۔ خدا نے دنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ جو کوئی اس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ

[24] Streeter in Immortality.p.148

ہمیشہ کی زندگی پائے۔ کیونکہ خدا نے بیٹے کو دنیا میں اس لئے بھیجا ہے کہ دنیا اس کے وسیلے سے نجات پائے"(یوحنا ۳: ۱۶ تا ۱۷)۔ چونکہ ابن اللہ مجسم محبت تھے لہذا ضرور ہوا کہ آپ دکھ اور اذیت اٹھائیں۔(یوحنا ۵: ۱۳)۔آپ بار بار شاگردوں کو تاکید کرکے سمجھاتے تھے (مرقس ۸: ۳۲) کہ " ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دکھ اٹھائے اور وہ قتل کیا جائے (مرقس ۸: ۳۱) آپ نے پھر فرمایا۔ کہ " ابن آدم آدمیوں کے ہاتھ میں حوالہ کیا جائے گا۔ اور وہ اسے قتل کرینگے"۔(متی ۱۷: ۲۲) پھر سہ بارہ فرمایا" دیکھو ہم یروشلیم کوجاتے ہیں اور ابنِ آدم سردار کاہنوں اور فقیہوں کے حوالے کیا جائیگا۔ اور وہ اس کے قتل کا حکم دیں گے اور اسے غیر قوموں کے حوالے کریں گے تا کہ وہ اسے ٹھٹھوں میں اڑائیں اور کوڑے ماریں اور صلیب پر چڑھائیں "(متی ۲۰: ۱۸۔ لوقا ۱۸: ۳۱تا ۳۲)۔پھر تاکید کرکے آپ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ " تمہارے کانوں میں یہ باتیں پڑی رہیں۔ کیونکہ ابن آدم آدمیوں کے ہاتھ میں حوالے کئے جانے کو ہے"(لوقا ۹: ۴۴) لیکن حواریوں نے " ان میں سے کوئی بات نہ سمجھی اور یہ قول ان پر پوشیدہ رہا اور ان باتوں کا مطلب ان کی سمجھ میں نہ آیا"(لوقا ۱۸: ۳۴) ان کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ خدا کے پیارے مسیح موعود کے تصور کے ساتھ دکھ اور اذیت اور صلیب اور قتل کو متعلق کریں ۔ خدا تعالیٰ کا ابن اور ابن اور صلیب! پس ایک شاگرد پطرس کلمۃ اللہ کو " الگ لے جا کر اسے ملامت کرنے لگا مگر اس نے پھر کے اوراپنے شاگردوں پر نگاہ کرکے پطرس کو ملامت کرنے لگا اورکہا اے شیطان میرے سامنے سے دور ہو کیونکہ تو خدا کی باتوں کا نہیں آدمیوں کی باتوں کا خیال رکھتاہے "(مرقس ۸: ۳۲تا ۳۳)۔ کلمۃ اللہ نے کہا کہ " آدمیوں کا خیال" یہ ہے کہ خدا کی محبت کا انسانی دکھ اور اذیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں لیکن الہٰی خیال اس کے بالکل برعکس ہے۔خدا کی محبت دکھ اور اذیت سے نہیں کتراتی بلکہ اس کا جلوہ اور ظہور ایثار میں ہوتاہے ۔ صلیب کی راہ " خدا کی باتوں" کی راہ ہے ۔ صلیب خدا کی محبت کا بہتریں مکاشفہ ہے اوراس کٹھن راہ کو اختیار کرکے ابن اللہ نے آسمانی باپ کی محبت کامکاشفہ بنی نوع انسان پر ظاہر کیاہے۔

قیصر یہ فلپی وہ جگہ تھی جہاں کلمۃ اللہ نے اس حقیقت کو اپنے شاگردوں پرظاہر فرمایا۔ اس جگہ ایک غار تھا جہا ں یونانی لوگ زمانہ سلف میں دیوتا (PAN) کی پرستش کیا کرتے تھے۔ اس جگہ ہیرودیس نے قیصر اگسطس کی آمد کے بعد ایک مندر بھی بنوایا تھا ۔ جہاں قیصرپرستی ہوتی تھی۔ پس یہ غار یونانیوں اور رومیوں کے مذاہب کی شان وشوکت ۔ صولت و سطوت اورجاہ وجلال کا ایک نمونہ تھا۔ اوراسی جگہ جہاں ان مذاہب باطلہ کا علم لہرتا تھا ۔ کلمۃ اللہ نے وہ تعلیم دی جو ان مذاہب کے بالکل برعکس تھی وہاں کلمۃ اللہ نے حقیر صلیب کو الہٰی محبت کا اعلیٰ ترین مظہر پیش کیا۔ آپ کے مطابق خدا ایک پرُمحبت ہستی ہے ۔ جس کی محبت ان تمام لوگوں کو تلاش کرتی ہے جواس سے

منحرف اور برگشتہ ہوگئے ہیں ان کو دوبارہ اپنے پاس لانے میں ہر طرح کا ایثار کرنے کو تیار ہے۔

اس حقیقت کی ایک جھلک یہودی انبیائے سلف کو ملی تھی اور انہوں نے اس کو دھندلی طور پر لوگوں تک پہنچایا تھا۔ (یسعیاہ ۵۳ باب) لیکن یہ صداقت صرف ابن اللہ کے ذریعہ بنی نوع انسان پر مہر نیم روز کی طرح روشن ہوگئی ہے۔ سیدنا مسیح کی زبانِ حقائق ترجمان نے یہ تعلیم دی ہے کہ صلیب درحقیقت الہیٰ جلال و عظمت کا پرتو ہے۔ صلیب کے جانکاہ سانحہ نے حواریوں کی آنکھیں کھولیں اور جو شے پہلے ان کے خیال میں انتہائی ذلت کا نشان تھی وہ الہیٰ محبت کا نشان ہوگئی۔ ابن اللہ نے اپنی زندگی اور موت سے خدا کی محبت کا اظہار لوگوں پر کردیا۔

سیدنا مسیح نے ہم کو تعلیم دی ہے کہ خدا باپ ایک واحد شخصیت رکھنے والی ہستی ہے۔ جو ہم سے محبت رکھتا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ خدا دیگر انسانوں کی طرح ایک شخص ہے۔ یا خدا انسان کی صورت پر ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ گو خدا اپنی خلقت سے بلند و بالا ہے اور اس کی ذات بعید از فہم وادراک ہے۔ تاہم جب اس کا تصور باندھتے ہیں تو اس صورت ہم کو دیگر اشیائے فطرت کی نسبت انسان میں بہترین طور پر دکھائی دیتی ہے۔ انسان" خدا کی صورت" پر پیدا کیا گیا ہے (پیدائش ۱: ۲۷) خدا کو بہترین انسانوں سے بھی بدرجہا بہتر ہونا چاہیے اور شخصیت کی اعلیٰ ترین صفات کو بدرجہ احسن واکمل خدا میں موجود ہونا چاہیے۔ پس اس میں عقل اور ارادہ اور محبت کامل درجہ میں موجود ہونا چاہیے۔ کلمۃ اللہ نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ خدا ہمارا باپ ہے جو ہم سے محبت رکھتا ہے اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ انسان بھی اس کے ساتھ محبت کا رشتہ پیدا کرے۔ لہذا گنہگاروں کو بچانے کی خاطر اس نے اپنے ابن کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ خدا کی محبت کا مکاشفہ گنہگار دنیا پر ظاہر کرے۔

(۲-)

ملا کی کتاب کے مصنف کے نزدیک خدا ہمارا" باپ" ہے کیونکہ اس نے ہم کو خلق کیا ہے(۲: ۱۰) لیکن کلمۃ اللہ کے نزدیک خدا محض خالق ہونے کی وجہ سے ہمارا باپ نہیں ہے آپ کی تعلیم میں خدا کے خالق ہونے پر زور دیا گیا۔ گو خدا کو خالق مانتے تھے(مرقس ۱۰: ۶) تاہم آپ نے کبھی اپنی زبانِ حقیقت ترجمان سے خدا کو خالق کے نام سے یاد نہیں کیا۔

زبور نویس یہوداہ کو اس عہد کی وجہ سے " باپ "کہتا ہے جو خدا اور اس کی برگزیدہ قوم اسرائیل میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ خدا نے اہل یہود کو اقوام عالم میں سے چن لیا ہے لہذا وہ اس برگزیدہ قوم کا" اس لحاظ سے باپ ہے۔ وہ اس لحاظ سے مختلف افراد کا" باپ" نہیں تھا بلکہ کل قوم اسرائیل کا " باپ" تھا۔ باپ " سے اہل یہود کی مراد یہ تھی کہ وہ صرف اہل یہود ہی خدا کے منظورِ نظر ہیں۔ چنانچہ یہود کہتے تھے " جب ہمارا باپ ابراہیم پیدا نہیں ہوا

تھا تب خدا صرف آسمان کا بادشاہ تھا لیکن جب ابراہیم پیدا ہوا تو اس نے خدا کو آسمان اور زمین دونوں کا بادشاہ بنادیا[25]۔

لیکن اناجیل سے مذکورہ بالا دونوں تصور کلیتہً غائب ہیں۔ کلمتہ اللہ کی تعلیم کے مطابق خدا ہمارا باپ ہے کیونکہ وہ ہم سے محبت کرتاہے۔ خدا کی محبت کسی خاص قوم ملک وملت یا فرد تک محدود نہیں بلکہ وہ تمام دنیا پر بلاامتیاز نسل حاوی ہے نہ تو اسرائیل کی قوم اور نہ اس قوم کا کوئی خاص فرد خدا کا خاص منظورِ نظر ہے بلکہ اقوامِ عالم اس کی مطمع محبت ہیں۔خدا ہر ملک اور ہر قوم اور ہر زمانہ کے ہر فرد بشر کے ساتھ کامل محبت رکھتاہے۔ گو مختلف افراد اپنے گناہوں کے باعث خدا سے دور بھٹک کر فرزندیت کے رشتہ کی طرف سے لاپرواہ ہوگئے ہوں۔ لیکن اس کی محبت ان کو فراموش نہیں کرتی۔ گوانسان اپنی معصیت کی وجہ سے ابنیت کے رشتہ کو توڑدے۔ لیکن الہیٰ محبت ہمیشہ یکساں رہتی ہے کیونکہ وہ ازلی اور ابدی محبت ہے۔ خدا تمام بنی نوع انسان کے ہر فرد کا باپ ہے ۔لیکن افراد کولازم ہے کہ اس محبت کے رشتہ کو جو ان کے گناہوں نے منقطع کردیا تھا ازسر نو توبہ کے وسیلے قائم کرکے خدا کے فرزند بن جائیں ۔ جو اشخاص اس طریقہ سے خدا باپ کی طرف رجوع نہیں کرتے وہ اپنی ابنیت کو کھوبیٹھتے ہیں۔ وہ اس لائق نہیں رہتے کہ خدا کے بیٹے کہلائیں۔(لوقا۱۵: ۱۹)لیکن جو اشخاص خدا کی لازوال محبت کو جان بوجھ کر نہیں ٹھکراتے بلکہ وہ اس کو قبول کرتےہیں ۔ وہ از سر نو" خدا کے فرزند بننے کے حقدار" ہوتےہیں (یوحنا ۱: ۱۲)۔

جیسا ہم ذکر کرچکے ہیں ۔ خدا کی عالمگیر ابوت کا تصور ربنا المسیح کی تعلیم کا بنیادی پتھر ہے اور یہ تصور تمام ادیانِ عالم بالخصوص اسلام میں کالنادر فی المعدوم کا حکم رکھتاہے۔ اسلام میں خدا کے ننانویں نام ہیں۔ لیکن ان اسمائے حسنہ میں " اب باپ" کا نام موجود نہیں اور نہ اس لفظ کا پاکیزہ اورلطیف مفہوم کسی اور نام سے قرآن مجید میں موجود ہے"۔اب یا رب" یہ دو تصور ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں ۔پہلا تصور مسیحی ہے اور دوسرا اسلامی ہے جو اسلام کی طبیعت اور شیوہ کے مطابق بھی ہے چنانچہ ڈاکٹر عبداللہ ایڈیٹر ترکی اخبار اجتہاد اگست ۱۹۲۴ء کی اشاعت میں لکھتاہے " انتقام پسند عربوں سے یہی امید کی جاسکتی تھی کہ ان کا اللہ قادر مطلق اورانتقام پسند ہوتا۔ لیکن میرا ایسے خدا پر ایمان ہے جو بالکل نیک ہے مجھے ایسے خدا کی ضرورت نہیں ہے جو مصیبت زدوں کے ساتھ دکھ اور مصیبت کے وقت روئے عربوں نے جبریہ اپنے خود ساختہ اللہ کو ہمارے گلے مڑھ دیا ہے اورہم کو تباہ کردیاہے"۔

(۳۔) خدا کی پروردگاری :

کلمتہ اللہ (جناب مسیح) کی تعلیم کے مطابق پروردگار ہمارے پالنے والے ہیں کیونکہ وہ ہماری پرواہ کرتے ہیں۔ وہ ہم سب کے

[25] Quoted by Dalman,The Words of Jesus,(Eng).

پروردگار ہیں۔ منجی عالمین نے فرمایا ہے کہ "اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے اور نہ اپنے بدن کی کیا پہنیں گے؟ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں تو بھی تمہارا پروردگار ان کو کھلاتا ہے۔ پوشاک کے لئے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں، وہ نہ محنت کرتے اور نہ کاتتے ہیں۔ تو بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ حضرت سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان وشوکت کے ان میں کسی مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھے۔ پس جب پروردگار عالم جب میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک عطا فرماتے ہیں، تو اے کم اعتقادو تم کو کیوں نہ عطا فرمائیگا۔ اس لئے فکرمند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے۔ اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو۔ جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں"(انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت متی علیہ السلام رکوع 6)

خدا کی محبت کی وجہ سے اس کی پروردگاری لامحدود ہے۔ کلمۃ اللہ نے فرمایا "کیا پیسے کی دو چڑیاں نہیں بکتیں؟ ان میں سے ایک بھی تمہارے پروردگار کی مرضی کے بغیر زمین پر نہیں گرسکتی۔ بلکہ تمہارے سر کے بال بھی سب گنے ہوئے ہیں پس ڈرو نہیں ۔ تمہاری قدر تو بہت سی چڑیوں سے زیادہ ہے "(انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت متی رکوع 10: آیت 29 تا 31) پس روزِ فردا کی بابت فکر کرنا خدا کی پروردگاری پر شک لانا ہے۔ کلمۃ اللہ کا یہ مطلب نہیں کہ ہم تن آسانی اختیار کرکے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں۔ بلکہ آپ کا مدعا یہ ہے کہ ہم روزی حاصل کریں لیکن ہر وقت روزی کے فکر میں ہلکان وغلطان نہ رہیں کیونکہ " ہمارا پروردگار جانتا ہے کہ ہم ان سب چیزوں کے محتاج ہیں "(انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت لوقا طبیب علیہ السلام رکوع 12: آیت 30) خدا کی لامحدود محبت اور پروردگاری کے سامنے ہماری کیا فکر کیا حقیقت رکھ سکتی ہے ؟" تم میں ایسا کون ہے جو فکر کرکے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے ؟ پس جب سب سے چھوٹی بات نہیں کرسکتے تو باقی چیزوں کا کیوں فکر کرتے ہو "(انجیل شریف بہ مطابق حضرت لوقا طبیب علیہ السلام رکوع 12: آیت 25–26)۔ پس لازم ہے کہ ہم فکریں پروردگار پر ڈال دیں کیونکہ ان کو اپنی بے زوال محبت کی وجہ سے ہماری فکر ہے۔

جناب مسیح نے یہ تعلیم بھی دی کہ ہمارے پروردگار کی محبت کل کائنات پر قادر ہے اور وہ اپنے ازلی ارادوں کو باوجود رکاوٹوں کے پورا کرکے چھوڑیں گے۔ خدا رب العالمین ہے اور فطرت اس کے ازلی ارادوں

کے ماتحت ہے۔ وہ "آسمان اور زمین کا خدا ہے"(انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت متی علیہ السلام رکوع 11آیت 25) اگر بظاہر ہم کو خدا کے ارادے کامیاب ہوتے نظر نہ آئیں لیکن وہ اس بات پر قادر ہے کہ " اس کی مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو "(انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت متی رکوع 6آیت 10)۔ کائنات کے کل قوانین اور طریقے اس کے ارادوں کو برانقضائے وقت پورا کرینگے اور خدا کی محبت تمام امور پر فاتح ہوگی۔اور اس کے پُر محبت ارادے جو وہ سیدنا عیسیٰ میں بنی نوع انسان کے لئے رکھتا ہے غالب ہو کر رہینگے۔

فصل دوم

(۱)

ایمان:

پس اگر ہم ایسے پُر محبت خدا پر ایمان رکھیں گے تو ہمیں "کسی طرح کی کمی نہ ہوگی" (زبور شریف رکوع 23آیت 1)لیکن ہمارا ایمان محض زبانی جمع خرچ نہیں ہوناچاہیئے بلکہ ہمارا یمان دلی وثوق کے ساتھ ہونا چاہیئے۔اگر ہم پروردگار پر ایمانِ کامل رکھیں گے تو ہماری تمام مشکلات حل ہوجائیں گی اور ہماری نظر میں کوئی شے ناممکن نہ رہے گی ۔ مسیح کلمتہ اللہ نے فرمایا ہے کہ "جو اعتقاد رکھتا ہے اس کے لئے سب کچھ ہوسکتا ہے"(انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت مرقس علیہ السلام رکوع 9 آیت 23) آپ ہر شخص کو جو آپ کے پاس شفا پانے یا کسی اور غرض کے لئے حاضر ہوتا فرماتے "خدا پر ایمان رکھو" (انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت مرقس علیہ السلام رکوع 11 آیت 22، انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت متی علیہ السلام رکوع 4آیت 40اور رکوع 13آیت 8وغیرہ) اور فرماتے کہ "خدا سے دعا کرو تاکہ وہ تم کو ایمان کی توفیق عطا کرے اور تمہاری بے اعتقادی کا چارہ کرے" (انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت مرقس علیہ السلام رکوع 9آیت 24،انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت لوقا طبیب علیہ السلام رکوع 17آیت 5)

کلمتہ اللہ کے نزدیک "ایمان " کسی عقیدہ کا مترادف نہ تھا جو فلسفیانہ دلائل کا محتاج ہو۔آپ کے خیال کے مطابق ایمان اس روحانی جذبہ کا نام ہے جس سے ہم خدا کو" اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت" سے اپنا مالک اور رب مانتے ہیں۔ اس روحانی حالت کا تجربہ ہے جس کی بناء پر استدلال کے ذریعہ عقاید کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے ۔لیکن کلمتہ اللہ نے عقاید پر کبھی زور نہ دیا۔ برعکس اِس کے آپ نے فرمایا کہ عقیدے کو ایمان کی جگہ غصب نہیں کرنی چاہیئے ۔(انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت متی علیہ السلام رکوع 7آیت 21سے 23) ۔آپ کی تعلیم کا سارا زور اس دلی جذبہ پر ہے جس کو "ایمان" کے نام سے موسوم کرتے

تھے۔ اور جس کے سامنے تمام دیگر باتیں ہیچ اور کم مایہ ہیں اور جو ایمان ہی درحقیقت دنیا میں سب سے عظیم الشان طاقت ہے۔ آپ نے فرمایا "پروردگار پر ایمان رکھو، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو کوئی اس پہاڑ سے کہے تو اکھڑ جا اور سمندر میں جا پڑ اور اپنے دل میں شک نہ کرے کہ جو کہتا ہے ہوجائیگا تو اس کے لیے وہی ہوگا ۔" (انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت مرقس علیہ السلام رکوع 11 آیت 23تا 24) حقیقی ایمان کی طاقت اس قدر زبردست ہے کہ آپ نے فرمایا " اگر تم میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو تو کوئی بات تمہارے لئے ناممکن نہیں ہوگی "(انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت متی علیہ السلام رکوع 17 آیت 20)

جہاں کہیں منجئی عالمین سیدنا عیسیٰ تشریف لے جاتے تھے آپ لوگوں میں ایمان کی تلاش کرتے تھے۔ (انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت متی علیہ السلام رکوع 9 آیت 22، رکوع 15 آیت 28، انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت لوقا طبیب علیہ السلام رکوع 7 آیت 9 وغیرہ) آپ کے لئے دنیا یہود اور غیر یہود پر منقسم نہ تھی ، بلکہ ایمانداروں اور بے ایمانوں پر منقسم تھی۔ جہاں آپ نے غیر یہود میں ایمان دیکھا آپ نے ان ایمانداروں کی نہ صرف تعریف کی بلکہ فرمایا کہ ان کو آلِ ابراہیم پر ترجیح ہے۔ چنانچہ آپ نے رومی صوبہ دار کے ایمان کی نسبت فرمایا کہ " میں نے اسرائیل کے کسی شخص میں ایسا ایمان نہیں پایا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ بہتیرے پورب اور پچھم سے آکر حضرت ابراہیم، حضرت اضحاق اور حضرت یعقوب کے ساتھ آسمان کی بادشاہت کی ضیافت میں شریک ہوں گے مگر بادشاہت کے فرزند باہر اندھیرے میں ڈالے جائیں گے " (انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت متی علیہ السلام رکوع 8 آیت 10 تا 12)

(۲)

گناہوں کی مغفرت اور نجات:

جب ہم انجیل شریف کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات منجئی جہان جب کسی کو شفا بخشتے ہیں تو اپنی ذات اور شخصیت پر ایمان رکھنا اس اعجازی واقعہ کی شرط قرار دیتے ہیں ۔(مرقس ۲: ۵۔ ۵: ۳۴۔ ۱۰: ۵۲، متی ۸: ۱۰ وغیرہ وغیرہ) اس ایمان کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہم خدا کی مغفرت کے فضل پر کامل بھروسہ رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مقدس پولوس کے نزدیک ایمان منجئی عالمین کی موت اور قیامت کے ساتھ وابستہ ہے (رومیوں ۳: ۲۵، گلتیوں ۲: ۲۱) اور راستبازی ایمان کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ انسان کے ذاتی اعمال پر اس کا انحصار نہیں (گلتیوں ۲: ۱۶، ۳: ۲، ۱۴۔ رومیوں ۳: ۲۷۔ الخ ۱۴: ۱، ۵، ۹: ۳۲، افسیوں ۲: ۸۔ فلپیوں ۳: ۹ وغیرہ) تاکہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ اس نے اپنے اعمال

سے نجات کمائی ہے۔ بلکہ یہ محض خدا کا فضل ہے (رومیوں ۳: ۲۷۔ افسیوں ۲: ۸ وغیرہ)

بے منت و بے سول و بے استحقاق
دیتا ہے جو سب کو یا الہیٰ تو ہے۔

کلمۃ اللہ نے اس حقیقت کو ایک تمثیل کے ذریعہ واضح کیا۔ آپ نے فرمایا" کیونکہ "آسمان کی بادشاہی " اس گھر کے مالک کی مانند ہے جو سویرے نکلا تا کہ اپنے تاکستان میں مزدور لگائے۔ اور اس نے مزدوروں سے ایک دینا روز ٹھہرا کر انہیں اپنے تاکستان میں بھیج دیا۔ پھر پہر دن چڑھے کہ قریب نکل کر اس نے اوروں کو بازار میں بیکار کھڑے دیکھا۔ اور ان سے کہا تم بھی تاکستان میں چلے جاؤ۔ جو واجب ہے تم کو دوں گا۔ پس وہ چلے گئے۔ پھر اس نے دوپہر اور تیسرے پہر کے قریب نکل کر ویسا ہی کیا۔ اور کوئی ایک گھنٹہ دن رہے پھر نکل کر اوروں کو کھڑے پایا اور ان سے کہا تم کیوں یہاں تمام دن بیکار کھڑے رہے ؟ انہوں نے اس سے کہا اس لئے کہ کسی نے ہم کو مزدوری پر نہیں لگایا۔ اس نے ان سے کہا تم بھی تاکستان میں چلے جاؤ۔ جب شام ہوئی تو تاکستان کے مالک نے اپنے کارندے سے کہا مزدوروں کو بلاؤ اور پچھلوں سے لے کر پہلوں تک ان کی مزدوری دے دو۔ جب وہ آئے جو گھنٹہ بھر دن رہے لگائے گئے تھے تو ان کو ایک ایک دینار ملا۔ جب پہلے مزدور آئے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم کو زیادہ ملے گا اور ان کو بھی ایک ہی ایک دینار ملا۔ جب ملا تو گھر کے مالک سے یہ کہہ کر شکایت کرنے لگے کہ ۔ ان پچھلوں نے ایک ہی گھنٹہ کام کیا ہے اور آپ نے ان کو ہمارے برابر کردیا جنہوں نے دن بھر کا بوجھ اٹھایا اور سخت دھوپ سہی ۔ اس نے جواب دے کر ان سے کہا میاں میں تمہارے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا ۔ کیا تمہارا مجھ سے ایک دینار نہیں ٹھہرا تھا؟ جو تمہارا ہے اٹھالو اور چلے جاؤ۔ میری مرضی یہ ہے کہ جتنا تمہیں دیتا ہوں اس پچھلے کو بھی اتنا ہی دوں۔ کیا مجھے روا نہیں کہ اپنے مال سے جو چاہوں سو کروں ؟ یا تم اس لئے کہ میں نیک ہوں بُری نظر سے دیکھتے ہو؟(متی ۲۰: ۱ تا ۱۵)۔

اس تمثیل سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی شخص اپنے اعمال پر نازاں ہو کر آسمان کی بادشاہت میں داخل نہیں ہوسکتا یہ آسمانی باپ کی ازلی محبت کا نتیجہ ہے کہ وہ ازراہِ کرم وفضل گنہگار انسان کو اپنی بادشاہت میں جگہ دیتا ہے فقط اس کی محبت پر ہمارا ایمان چٹان کی طرح مضبوط اور محکم ہونا چاہیے ۔ خدا کی محبت اس قدر زبردست اور غالب ہے کہ ہماری خطائیں اس کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتیں۔

کہہ کے لبیک مغفرت دوڑے
توبہ عاصی اگر کرے دل سے

خدا نیکوں اور بدکاروں دونوں کا باپ ہے اور دونوں سے یکساں محبت رکھتا ہے (متی ۵: ۴۵) ابوت کا رشتہ گناہوں کی وجہ سے منقطع نہیں ہوجاتا ۔ پس ابنیت کا رشتہ توبہ کے ذریعے از سر نو قائم ومضبوط ہوجاتا ہے۔ نجات کی

برکت حاصل کرنے کے لئے توبہ پہلی اور لازمی شرط ہے۔(مرقس ۱: ۱۵۔ ۱۶: ۱۲۔متی ۱۱: ۲۱۔لوقا ۲۴: ۴۷وغیرہ) توبہ سے مراد یہ ہے کہ ہماری طبیعت کا میلان کلیتہً بدل جائے۔ اور ہم گناہ آلودہ زندگی کو ترک کرکے خدا کی طرف رجوع لائیں"۔(متی ۱۳: ۱۵۔۱۸: ۳)۔

کلمتہ اللہ نے ایک تمثیل کے ذریعہ اس حقیقت کو لوگوں پر روشن کیااور فرمایا تم میں ایسا بھی کوئی ہے جس کے پاس سو بھیڑیں ہوں اور ان میں سے ایک کھوجائے تووہ باقی ننانوے بھیڑوں کو بیابان میں چھوڑ کر اس کھوئی ہوئی بھیڑ کی تلاش نہ کرتا رہے جب تک کہ وہ مل نہ جائے ؟ اور جب مل جاتی ہے تو خوشی خوشی اسے اپنے کندھوں پر اٹھالیتا ہے ۔اور گھر آکر اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کو جمع کرتا ہے اور کہتا ہے : میرے ساتھ مل کر خوشی مناؤ کیونکہ میری کھوئی ہوئی بھیڑ مل گئی۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ اسی طرح ننانوے پرہیزگاروں کی نسبت جو توبہ کی حاجت نہیں رکھتے ایک توبہ کرنے والے گنہگار کے باعث آسمان پر زیادہ خوشی منائی جائے گی۔(لوقا ۱۵: ۳تا۷)۔

پھر ایک اور تمثیل کے ذریعہ کلمتہ اللہ نے یہی حقیقت لوگوں پر روشن کی کہ آسمانی باپ کی خوشی دوبالاہوجاتی ہے۔جب کوئی گنہگار توبہ کرکے اس کی طرف رجوع کرتاہے ۔آپ نے فرمایا "کیا ایسی بھی کوئی عورت ہوگی جس کے پاس چاندی کے دس سکے ہوں اور ایک کھوجائے اور وہ چراغ جلا کر گھر میں جھاڑو نہ دیتی رہے اور جب تک مل نہ جائے اسے ڈھونڈتی نہ رہے ؟اور ڈھونڈلینے کے بعد وہ اپنی سہیلیوں اور پڑوسنوں کو بلا کر یہ نہ کہے کہ میرے ساتھ مل کر خوشی مناؤ کیونکہ میں نے اپنا کھویا ہوا سکہ پالیا ہے ۔پس میں تم سے کہتاہوں کہ ایک گنہگار کے توبہ کرنے پر بھی پروردگارِ عالم کے فرشتوں کے سامنے خوشی منائی جاتی ہے۔(لوقا ۱۵: ۸تا۱۰)۔

اسی حقیقت کو ایک اور تمثیل سے سیدنا مسیح نے واضح کیا اور فرمایا " کسی شخص کے دوبیٹے تھے۔ ان میں سے چھوٹے نے اپنے والد سے کہا: اباجان! جائداد میں جو حصہ میرا ہے مجھے دے دیں۔ اس نے جائداد ان میں بانٹ دی۔ تھوڑے دن بعد چھوٹے بیٹے نے اپناسارا مال ومتاع جمع کیا اور دور کسی دوسرے ملک کو روانہ ہوگیا اور وہاں اپنی ساری دولت عیش وعشرت میں اڑادی ۔جب سب کچھ خرچ ہوگیا تو اس ملک میں ہر طرف سخت قحط پڑا اور وہ محتاج ہوکررہ گیا۔جب وہ اس ملک کے ایک باشندے کے پاس کام ڈھونڈنے پہنچا۔ اس نے اسے اپنے کھیتوں میں سور چرانے کے کام پر لگادیا۔ وہاں وہ ان پھلیوں سے جنہیں سور کھاتے تھے اپنا پیٹ بھرنا چاہتا تھا لیکن کوئی اسے پھلیاں بھی کھانے نہیں دیتا۔ تب وہ ہوش میں آیا اور کہنے لگا: میرے والد کے مزدوروں کو ضرورت سے بھی زیادہ کھانا ملتا ہے لیکن میں یہاں قحط کی وجہ سے بھوکا مررہاہوں۔ میں اٹھ کر اپنے والد کے پاس جاؤں گا اور ان سے کہوں گا: ابا جان! میں پروردگار کی نظر میں اور آپ کی نظر میں گنہگار ہوں۔ اب تو میں اس لائق بھی نہیں رہا کہ آپ کا بیٹا کہلا سکوں ۔ مجھے اپنے مزدوروں میں شامل

کرلیں۔ پس وہ اٹھا اور اپنے والد کے پاس چل دیا۔ لیکن ابھی وہ کافی دور تھا کہ اس کے والد نے اسے دیکھ لیا اور اسے اس پر بڑا ترس آیا۔ اس نے دوڑ کر اسے گلے لگالیا اور خوب پیار کیا۔ بیٹے نے اس سے کہا: اباجان میں پروردگار کی نظر میں اورآپ کی نظر میں گنہگار ہوں ، اب تو میں اس لائق بھی نہیں رہا کہ آپ کا بیٹا کہلاسکو۔ مگر والد نے اپنے نوکروں سے کہا: جلدی کرو اور سب سے پہلے ایک بہترین چوغہ لاکر اسے پہناؤ اس کے ہاتھ میں انگوٹھی اور پاؤں میں جوتی پہناؤ۔ ایک موٹا تازہ بچھڑا لاکر ذبح کرو تاکہ ہم کھائیں اور خوشی منائیں۔ کیونکہ میرا بیٹا جو مرچکا تھا وہ زندہ ہوگیا ہے ، کھو گیا تھا اب ملا ہے ۔پس وہ خوشی منانے لگے۔(لوقا ۱۵: ۱۱تا۲۴)۔

میری بندگی سے میرے جرُم افزوں
تیرے قہر سے تیری رحمت زیادہ

جب کوئی گنہگار تائب ہو کر خدا کی طرف رجوع کرتاہے تو وہ معلوم کرتاہے کہ اس کا آسمانی باپ ازراہِ محبت مدت سے اس کی واپسی کا انتظار کررہا تھا۔ وہ جو پہلے اپنے گناہوں کی وجہ سے دور تھا اب خدا کے خاندان میں نوکر کی طرح نہیں بلکہ بیٹے کی طرح رہتاہے۔(یوحنا ۱۵: ۱۵)۔

تڑپ کے شانِ کریمی نے لے لیا بوسہ
کہا جو سر کو جھکا کر کہ گنہگار ہوں میں
(اقبال)

توبہ کے بعد خدا اور اس کے تائب بیٹے میں محبت کی وجہ سے رفاقت کا سلسلہ از سر نو شروع ہوجاتاہے جو تا ابد قائم رہتاہے(یوحنا ۱۵: ۱)۔آسمانی باپ کی نظر میں گناہ ایک ایسی شے نہیں جو ابد تک خدا اور انسان میں ایک وسیع خلیج حائل کردے اور انسانی فطرت کو ایسا بگاڑدے کہ وہ خدا کے ساتھ آئندہ کبھی رفاقت ہی نہ رکھ سکے۔ انجیل شریف کے مطابق گناہ ایک غلامی ہے۔ جس سے کلمتہ اللہ ہمیں رہائی دیتے ہیں۔ وہ ایک بیماری ہے ۔ جس سے ابن اللہ شفا بخشتا ہے۔ گناہ ایک قرض ہے جو خدا معاف کرتا ہے وہ ایک ناپاکی ہے ۔ جس میں ہم پاک صاف کئے جاتے ہیں کلمتہ اللہ یہودی ربیوں کی مانند گناہ کی ابتدا کا کوئی خاص نظریہ قائم نہیں کرتےآپ کی نظر میں گناہ ایک حقیقت ہے اور بس۔آپ گناہ کی نسبت تعلیم دینے کے لئے اس دنیا میں نہیں آئے تھے۔ بلکہ گناہ سے نجات دینے کے لئے آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گناہ کا لفظ صرف سات مرتبہ انجیل شریف میں وارد ہوا ہے۔ اور منجئی عالمین صرف تین موقعوں پر گناہ کا ذکر کرتے ہیں ۔ اوروہ بھی گناہوں کی مغفرت کے سلسلہ میں۔آپ کے نزدیک گناہ اس فعل یا جذبہ کا نام ہے۔ جو خدا اور انسان کے رشتہ میں خلل ڈالتاہے۔ اس کے پنجہ سے خدا کے نافرمان فرزند منجئی عالمین کے ذریعہ رہائی حاصل کرکے از سر نو خدا کے خاندان میں شامل ہوجاتے ہیں۔

ایسے غفار اور پرُمحبت خدا پر راسخ ایمان رکھنے کا قدرتی اثرہمارے اعمال وافعال پر پڑتاہے۔ کلمتہ اللہ نے فرمایا" چاہیے کہ تم کامل ہو۔ جیسا تمہارا

آسمانی باپ کامل ہے "(متی ۵: ۴۸)۔ یہ بظاہر ناممکن معلوم ہوتاہے لیکن اگرہمارا ایمان آسمانی باپ پر ہے جس کی محبت تمام روکاوٹوں پر غالب ہے۔ تو اس پر ایمان رکھنے سے سب ناممکن باتیں ممکن ہوجاتی ہیں۔ زکی محصول لینے والا ابراہام کا بیٹا ہوجاتاہے ۔ مریم مگدلینی مقدسہ بن جاتی ،متی محصول لینے والا انجیل نویس ہوجاتاہے۔ کمزور اور بزدل پطرس چٹان کی طرح مضبوط ہوجاتاہے ۔ گنہگار قدسی ہوجاتے ہیں ۔ ڈاکو فردوس میں داخل ہوجاتاہے ۔ یہ ضروری امر ہے کہ ہمارا ایمان ہمارے جذبات اور افعال کو متاثر کریگا۔ ہر قسم کے زندہ ایمان کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ہمارے باطن صاف اور ہمارے اعمال نیک ہونگے۔ کیونکہ " ہر ایک اچھا درخت اچھا پھل لاتاہے اور بُرا درخت بُرا پھل لاتا ہے ۔ اچھا درخت بُرا پھل نہیں لاسکتا نہ بُرا درخت اچھا پھل لاسکتاہے(متی ۷: ۱۷ تا ۱۸)۔ اسی حقیقت کو سیدنا مسیح نے ایک فریسی عالم نکودیمس پر ان معنی خیز الفاظ میں ظاہر کیا کہ " جب تک کوئی شخص از سر نو پیدا نہ ہو وہ خدا کی بادشاہت کو دیکھ نہیں سکتا"۔(یوحنا ۳: ۳)۔ یہی وجہ ہے کہ منجئی عالمین نے فرمایا کہ جن کا ایمان محض زبانی جمع خرچ کا ہے " جو مجھ سے اے مولا اے مولا کہتے ہیں ان میں سے ہر ایک آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگا۔مگر وہی جو میرے آسمانی باپ کی مرضی پرچلتا ہے "(متی ۷: ۲۱)وہ لوگ جن کا ایمان ان کے اعمال میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا درحقیقت بدکار ہیں ۔ خواہ وہ مسیح کے نام سے نبوت کریں ، بدروحیں نکالیں یا معجزے بھی دکھائیں(متی ۷: ۲۳۔ لوقا ۱۳: ۲۵تا ۲۸)۔ حقیقی ایماندار مقدسہ مریم صدیقہ سے بھی زیادہ مبارک حال ہیں۔ کیونکہ وہ "خدا کا کلام سنتے اور اس پر عمل کرتے ہیں"(لوقا ۱۱: ۲۷تا ۲۸)۔ صرف ایسے لوگ کلمتہ اللہ کے حقیقی رشتہ دار ہیں آپ نے خود فرمایا ہے"جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلتاہے ۔ وہی میرا بھائی اور بہن اورماں ہے "(مرقس ۳: ۳۵)۔

لیکن جو شخص ایماندار ہوکر بھی اپنی زندگی کو "تاریک کاموں" میں صرف کرتاہے اور" دنیا کے نور" کی پیروی نہیں کرتا۔ خدا کی لامحدود محبت اس شخص کی منتظر رہتی ہے کہ وہ کب توبہ کرکے رجوع لائے اوراپنی زندگی کو سدھارے ۔چنانچہ اس امر کو سیدنا مسیح نے ایک تمثیل کے ذریعہ واضح کیا اور فرمایا" کسی آدمی نے اپنے تاکستان میں انجیر کا درخت لگا رکھا تھا۔ وہ اس میں پھل ڈھونڈنے آیا مگر نہ پایا۔ تب اس نے باغبان سے کہا : دیکھو میں پچھلے تین برس سے اس انجیر کے درخت میں پھل ڈھونڈنے آتا رہا ہوں اور کچھ نہیں پاسکا ہوں۔ اسے کاٹ ڈالو ۔ یہ کیوں جگہ گھیرے ہوئے ہے ؟ لیکن اس نے جواب میں سے کہا : مالک ! اسے اس سال اور باقی رہنے دیں، میں اس کے ارد گرد کھدائی کرکے کھاد ڈالوں گا۔ اگر یہ آئندہ پھل لایا تو خیر ورنہ اسے کٹوادینا۔(لوقا ۱۳: ۶ تا ۹)۔پس خدا کی محبت ہر گنہگار کی منتظر رہتی ہے۔ لیکن اگرپھر بھی کوئی شخص اپنی مرضی کو خدا کی لازوال محبت کے تابع نہیں کرتا اوراس کو ٹھکراتا رہتا ہے ۔ تووہ فاعل خود مختار ہونے کی وجہ سے توبہ کا ہر موقعہ

کھو کر اپنے آپ کو نجات کے امکان سے خود باہر کردیتاہے اور ایسے گناہ کا مرتکب ہوجاتاہے جو معاف نہیں ہوسکتا ۔(متی ۱۲: ۳۲)۔ کیونکہ وہ خود معافی سے کوسوں دور بھاگتاہے ۔ وہ اپنے فعل خود مختاری کی وجہ سے اس درخت کی طرح ہوجاتاہے جو اچھا پھل نہیں لاتا۔ وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتاہے"(متی ۷: ۱۹)۔ ایسا شخص اس بے وقوف آدمی کی مانند ٹھہریگا جس نے اپنا گھر ریت پر بنایا اور مینہ برسا اور پانی چڑھا او آندھیاں چلیں اور اس گھر کو صدمہ پہنچا اور وہ گرگیا اور بالکل برباد ہوگیا"(متی ۷: ۲۶تا ۲۷)۔

(۳)

دعا:

تائب گنہگار اور آسمانی باپ میں توبہ کے وسیلے رفاقت کا سلسلہ ازسر نوشروع ہوجاتاہے۔ رفاقت کا رشتہ دعا کے وسیلے قائم اور مضبوط رہتاہے۔ کلمۃ اللہ کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا اور انسان کے درمیان کسی تیسرے شخص کی ضرورت ہی باقی نہ رہی بلکہ انسان کا تعلق سیدھا خدا سے پیدا ہوگیا ہے۔ یوں کلمۃ اللہ نے کاہنوں اور لیویوں اور فقہیوں اور شرع کے عالموں کے مختلف گروہوں کو جو خدا اور انسان کے بیچ درمیانی ہونے کے دعویدار تھے کلیتہً موقوف کردیا۔ اب ہمارا آسمانی باپ اپنے کلام کے ذریعہ اپنے بیٹوں کے ساتھ رفاقت رکھتاہے اور بیٹے دعا کے وسیلے اپنے باپ کے ساتھ رفاقت رکھتے ہیں۔ اگر یہ رفاقت قائم رہتی ہے۔ تو جو بیٹا مانگے گا وہ اس کے لئے ہوجائیگا۔(یوحنا ۱۵: ۷)۔ کلمۃ اللہ نے فرمایا " مانگو تو تم کیا عطا کیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔ کیونکہ جو کوئی مانگتا ہے اسے ملتا ہے اور جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے اور جو کھٹکھٹاتا ہے اس کے واسطے کھولا جائے گا۔(متی ۷: ۷تا ۸)۔ پس " جو کچھ دعا میں ایمان کے ساتھ مانگوگے وہ سب تمہیں ملیگا"(متی ۲۱: ۲۲)۔

لیکن ہمیں یادرکھنا چاہیے کہ ہماری تمام درخواستیں خدا باپ کی مرضی کے مطابق ہونی چاہئیں۔ کلمۃ اللہ نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ ہماری دعاؤں اور مناجاتوں کا اصول یہ ہونا چاہیے کہ خدا کی " مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو"(متی ۶: ۱۰)پس ہماری تمام مناجاتیں اسی ایک اصول کے ماتحت ہونی چاہئیں۔ خود ابن اللہ نے جب باغ گتسمنی میں زور زور سے پکار کر اور آنسو بہابہا کر" ۔(عبرانیوں ۵: ۷) خدا سے درخواست کی تو ساتھ ہی بارگاہ ایزدی میں عرض کی کہ " اے باپ! جیسا میں چاہتا ہوں ۔ ویسا نہیں بلکہ جیسا تو چاہتا ہے ویسا ہی ہو۔ اے میرے باپ! اگر یہ پیالہ میرے پئے بغیر نہیں ٹل سکتا۔ تو تیری مرضی پوری ہو"(متی ۲۶: ۳۹تا ۴۲) جب ہمارے کامل نمونہ نے اپنی مرضی کو رضائے الہیٰ کے تابع کیا۔ تو " اس کی سنی گئی "(عبرانیوں ۵: ۷۔ یوحنا ۱۱: ۴۲)۔ اسی طرح ہم کو بھی لازم ہے کہ

ہم بھی اپنے خیالات اورجذبات کو رضائے الہیٰ کےتابع کریں۔ تاکہ ہماری دعائیں اورالتجائیں بھی مقبول ہوں۔

دعا کاواحد مقصد یہ ہے۔کہ ہم مشیت الہیٰ کومعلوم کرکے اس پر عمل کرنے کی توفیق خدا سے حاصل کریں۔ایک ابتدائی مسیحی مصنف کہتاہے کہ " تم مانگتے ہو اورپاتے نہیں اس لئے کہ بُری نیت سے مانگتے ہوتاکہ اپنی عیش وعشرت میں خرچ کرو"(یعقوب ۴: ۳)۔ ہماری درخواستیں خود غرضی اور دنیاوی خیالات پر مبنی نہیں ہونا چاہئیں۔ بلکہ رضائے الہیٰ اور اس کی قدوس مرضی کے تابع ہونا چاہئیں۔ تب وعدہ خداوندی پورا ہوگا۔ کہ" جوکچھ تم مانگتے ہو یقین کروکہ تم کومل گیا۔ اور تمہارے لئے ہوجائیگا" (مرقس ۱۱: ۲۴)۔

بعض لوگ جب دعا کرتے ہیں اوران کی دعاؤں کا جواب ملتا نظر نہیں آتا تو وہ خدا کی شفقت ورحمت اوراس کی محبت اور پروردگاری پر شک کرکے اس کو " بے رحم" ، " بے انصاف " اور لاپرواہ" خیال کرنے لگ جاتے ہیں۔ کلمتہ اللہ ایسے اشخاص کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں کہ" پس جب کہ تم بُرے ہوکراپنے بچوں کواچھی چیزیں دینا جانتے ہو تو تمہارا پروردگار جوآسمان پر ہے اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ عطا فرمائے گا؟(متی ۷:۹تا ۱۱)آپ کا مطلب یہ ہے کہ فرض کرو کہ تمہارا خیال درست ہے اور بفرض محال خدا " بے رحم" ہے۔ توبھی وہ ہمارا باپ ہے۔ بے رحم سے بے رحم باپ بھی " اپنے بچوں کو اچھی چیزیں "دیتا ہے تو(توبہ نعوذ بااللہ)"بے رحم "آسمانی باپ اپنے بچوں کواچھی چیزیں کیوں نہ دیگا ؟

آپ نے ایسے اشخاص کو" بے انصاف " قاضی کی تمثیل سنائی ۔ اور فرمایا" ایک شہر میں ایک قاضی تھا۔ وہ نہ تو اللہ وتبارک تعالیٰ سے ڈرتا نہ انسان کی پرواہ کرتا تھا۔ اس شہر میں ایک بیوہ بھی تھی جواس قاضی کے پاس آتی رہتی تھی اور اس سے التجا کیا کرتی تھی کہ میرا انصاف کرو اور مجھے مدعی سے نجات دلواؤ۔ پہلے تو اس نے کچھ دھیان نہ دیا۔لیکن جب یہ سلسلہ جاری رہا تو اس نے اپنے جی میں کہا: سچ ہے کہ میں خدا سے نہیں ڈرتا اور انسان کی پرواہ بھی نہیں کرتا۔ لیکن یہ بیوہ مجھے پریشان کرتی رہتی ہے اس لئے میں اس کا انصاف کروں گا۔ورنہ یہ توروز آکرمیرا ناک میں دم کردے گی۔(لوقا ۱۸: ۱تا ۵)کلمتہ اللہ کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک" بے انصاف" قاضی نے بیوہ کی فریاد رسی کی تو بفرض محال خدا " بے انصاف" ہی سہی کیا وہ انصاف نہ کریگا۔ صرف ہم کو" ہر وقت دعا مانگتے رہنا چاہیے "(لوقا ۱۸: ۱)۔

کلمتہ اللہ نے ایک اور تمثیل کے ذریعے ایسے اشخاص پر ان کے خیالات کی بطالت ظاہر فرمائی ۔آپ نے فرمایا" فرض کرو کہ تم میں سے کسی کا ایک دوست ہے ۔ وہ آدھی رات کو اس کے پاس جا کر کہتاہے کہ اے دوست مجھے تین روٹیاں دے ۔ کیونکہ میرا ایک دوست سفر کرکے میرے پاس آیا ہے اور میرے پاس کچھ بھی نہیں کہ اسکی خاطر تواضع کرسکوں اور وہ اندر سے

جواب میں کہتا ہے ۔مجھے تکلیف نہ دے ،دروازہ بند ہے اور میں اور میرے بال بچے بستر میں ہیں، میں اٹھ کر تجھے دے نہیں سکتا ۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ اگرچہ وہ اس کا دوست ہے وہ اٹھ کر نہ بھی دے تو بھی اس کے بار بار اصرار کرنے کے باعث ضرور اٹھے گا اور جتنی روٹیوں کی اسے ضرورت ہے دے گا ۔(لوقا ۱۱: ۵تا ۸)۔ آپ کا یہ مطلب یہ تھا کہ جب ہمارے دنیاوی دوست جو ہماری ضروریات کی طرف سے لاپرواہوتے ہیں اور ہماری حاجت روائی کرنا نہیں چاہتے ہماری ضرورت دیکھ کر وقت بے وقت تکلیف اٹھا کر بھی ہم پر چاروناچار مہربانی کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں تو بفرض محال اگرہمارا آسمانی باپ" لاپروا" ہے تو کیاوہ ہماری ضرورت دیکھ کر ہماری حاجت روائی نہ کریگا؟لیکن ہمارا خدا نہ تو بے رحم دنیاوی باپ کی طرح " بے رحم" ہے۔ نہ بے انصاف قاضی کی طرح" بے انصاف" ہے اور نہ وہ لاپروا دوست کی طرح" لاپروا" ہے۔ وہ ہمارا آسمانی باپ ہے جو ہم کو" ابدی محبت سے پیار کرتاہے" ۔(یرمیاہ ۳۱: ۳) اورہمارے مانگنے سے پہلے ہماری ضروریات سے واقف ہے (متی ۶: ۸)وہ ضرورہماری دعاؤں کو سنیگا اورہماری حاجت روائی کریگا ۔ ہم پر واجب ہے کہ ہم مستعدی اور دلسوزی سے"(لوقا ۲۲: ۴۴) اپنی درخواستیں کرتے جائیں" ہم چپکے نہ رہیں اور خدا کو چین نہ لینے دیں"۔(یسعیاہ ۶۲: ۶)۔ جب تک ہماری دعائیں بارگاہ ایزدی میں صرف اجابت وقبولیت حاصل نہ کرلیں۔ ممکن ہے کہ ظاہر اطور پر ہم کو ہماری دعاؤں اور التجاؤں کا جواب ملتا نظر نہ آتا ہو۔ لیکن اس سے ہم کو دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ لاپروا دوست اور بے انصاف قاضی سے بھی جواب ملتا نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن پھر بھی انہوں نے سائلوں کی مشکلات کو حل کردیا خواہ کسی وجہ سے بھی بارگاہ الہیٰ سے جواب ملتا نظر نہ آئے ہم کو" ہمت نہ ہارنی چاہیے" بلکہ ہر وقت دعامانگتے رہنا چاہیے"(لوقا ۱۸: ۱)۔

منجئی کونین کا طرز عمل ہمارے لئے ایک کامل نمونہ ہے آپ کے لئے دعا کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو صرف خاص اوقات میں کی جائے۔ جو یہودی ربیوں نے مقرر کررکھے تھے نہ وہ کوئی ایسی بات تھی جو صرف دکھ مصیبت تنگی یا ضرورت کے وقت ہی مانگی جائے ۔آپ کے خیال میں کسی دعا کے خاص الفاظ میں اعجازی اثر موجود نہ تھا اور نہ دنیاوی ضروریات کے ماتحت آپ دعا کیا کرتے تھے۔ زبور نویس کی دعاؤں میں ہم کو دنیاوی عنصر غالب نظر آتا ہے ۔ وہ اپنی دعاؤں میں خدا سے حجت وتکرار کرتاہے ۔ لیکن کلمۃ اللہ کی دعائیہ زندگی سے یہ تمام باتیں خارج ہیں۔

انجیل شریف میں مرقوم ہے ک آپ کی عادت تھی کہ" صبح سویرے دن نکلنے سے بہت پہلے " آپ اٹھ کر ویران جگہ میں جاتے اور دعا مانگا کرتے تھے (مرقس ۱: ۳۵، لوقا ۱۱: ۱۔ متی ۱۴: ۲۳)۔آپ شب بیدار تھے " اور دعامانگنے میں ساری رات " گذار دیا کرتے تھے(لوقا ۶: ۱۲)تمام ضروری امور کو سرانجام دینے سے پہلے آپ اپنے باپ سے دعا کرتے (لوقا ۹: ۱۸- ۱۶ : ۱۳، مرقس ۹: ۲۶)۔ دکھ تکلیف کے وقت آپ تسلی کے لئے آسمانی باپ

کی طرف رجوع کرتے (مرقس ۱۴: ۳۲تا ۴۲) باپ کی حمدو ستائش ہمیشہ آپ کی وردزبان رہتی (متی ۱۱: ۲۵تا ۲۷- لوقا ۱۰: ۲۱تا ۲۲، یوحنا ۱۱: ۴۱وغیرہ)۔

شاگردوں نے جو شب وروز خلوت اور جلوت میں آپ کے ساتھ رہتے تھے دیکھا کہ آپ مردِ دعا ہیں اور مستجاب الدعوات ہیں ۔ تو آپ سے درخواست کی کہ اے ربی ہم کو بھی دعا مانگنی سیکھا۔ (لوقا ۱۱: ۱)۔ استاد ازل نے اپنی زبان مبارک سے فرمایا کہ جب تم دعا مانگو توکھو" اے ہمارے باپ توجوآسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے تیری بادشاہت آئے تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے ۔ اور جس طرح ہم نے اپنے قصورواروں کو معاف کیا ہے توبھی ہمارے گناہ ہمیں معاف کر۔ اور ہمیں آزمائش میں نہ لا۔ بلکہ برائی سے بچا"۔ اس مختصر سی دعا میں سالکینِ راہ خدا کے اعلیٰ ترین جذبات اورانتہائی آرزو میں موجود ہیں۔ یہ چھ فقرے نہایت ہی مانع اورجامع حق اللہ اورالعباد پر محیط اور ان پر شامل ہیں۔ پہلے تین فقروں میں خدا کی بادشاہت کی آمد۔ خدا کے نام کی تقدیس اور رضائے الہیٰ کے پورا ہونے کے لئے دعا ہے اور باقی تین میں خدا کی پروردگاری الہیٰ مغفرت اورشیطان سے پناہ اور نیکی کرنے کی توفیق کے لئے دعا کی گئی ہے۔

اس دعا کا معلم ہم کو فرماتاہے کہ " دعا مانگتے وقت دیگر اقوام کے لوگوں کی مانند بک بک نہ کرو کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے بہت بولنے کے سبب ہماری سنی جائیگی"(متی ۶: ۷)دعا میں ہم طوطے کی طرح رٹے ہوئے الفاظ نہ پڑھ کر سنائیں۔ اور نہ ہماری زبانیں مشین کی طرح چلیں ۔ ہم اہلِ ہنود کی طرح رام رام نہ کریں۔ اور نہ اہلِ اسلام کی طرح تسبیح پر اللہ اللہ جپتے رہیں ان مذاہب کے لوگوں کا خیال ہے کہ صرف خدا کا نام لینے میں کوئی اعجازی اثر یا جادو موجود ہے۔ لہذا ان کے " بہت بولنے کے سبب ان کی سنی جائیگی۔ دعا کرتے وقت یہ نہ کھو کہ ہم زبان سے الفاظ نکالتے جائیں اور توجہ خدا باپ کی طرف نہ ہو اور نہ ہم مسلمانوں کی طرح غیر زبان میں دعا کریں ۔ اس قسم کی دعا سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ انسانی کلام اندرونی مدعا مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ جب تک ہمارے اندر کوئی خواہش یا خیال ظاہر ہونے کے لئے جوش زن نہ ہو ہم کو خواہ مخواہ دعا میں بک بک نہیں کرنا چاہیے لیکن اگر دل میں خواہش ہو تو خواہ ہم کہیں ہوں، کسی حالت میں ہوں، کسی طرح کے کپڑوں میں ملبوس ہوں، ہمارا رخ دنیا کے کسی کونہ کی طرف ہو ہم اپنے آسمانی باپ کی طرف رجوع کرسکتے ہیں۔ اس قسم کی تعلیم ہمیں دیگر ادیانِ عالم میں نہیں ملتی ۔ مثلاً قرآن بڑی تفصیل سے آدابِ عبادت ہم کو بتاتاہے۔ (نساءآیت ۴۶، مائدہ آیت ۸)۔ اوقات عبادت پر قید لگاتا ہے ۔ (ہود آیت ۱۱۶، بنی اسرائیل آیت ۸۰) جائے عبادت کا بھی ذکر کرتاہے ۔(بقرآیت ۱۸۳، ۱۹۲، ۱۹۴)نمازی کے قبلہ رخ ہونے پر مصر ہے۔ (بقرآیت ۱۲۹)حکم دیتا ہے کہ خاص ایام میں اور خاص اوقات میں اور خاص حالات میں

دعا بالکل نہ کی جائے (نساءآیت ۴۲) لیکن کلمۃ اللہ کے روحانی اصول نے دعا اور نماز کو زمان ومکان کی قیود سے اور تمام رسوم ورواج سے آزاد کردیاہے۔ عیسائی ہر وقت دعا کرسکتاہے۔وہ ہر سمت کو اپنا قبلہ بناسکتاہے۔ اس کی نماز کبھی قضا نہیں ہوتی وہ سجدہ کرتا ہے مگر رکوع وسجود کے شمار میں سرگردان نہیں رہتا۔

بخدا خبر ندارم چونمازمی گذارم
کہ تمام شدُرر کوع کہ امام شد فلانے

(مولاناروم)

یہودیوں کی روزمرہ زندگی میں تین باتیں تھیں۔ جس پر ہر راستباز شخص عمل کرتا تھا۔ یہ تین باتیں دعا، خیرات اور روزہ تھیں توبت کی کتاب میں لکھاہے " دعا روزہ کے ساتھ اور خیرات راستبازی کے ساتھ اچھی ہے(۱۲: ۸)دعاروزانہ تین دفعہ مقرری اوقات پر کی جاتی تھی اور یہودی ربی کہتے تھے کہ ہر شخص دعا کے مقررہ وقت پر دعا کرے خواہ وہ کہیں [26]۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ" بازاروں کے موڑوں پر کھڑے ہوکر" دعا مانگا کرتے تھے (متی ۶: ۵)اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا تھا۔ کہ بہت سے لوگ محض دکھلاوے کی خاطر دعا مانگا کرتے تھے۔ اس کے خلاف منجئی عالمین ہم کو خبردار کرتے ہیں آپ نے یہ تعلیم دی کہ دعامیں ریاکاری کی قطعی کوئی آمیزش نہ ہو۔آپ نے فرمایا" جب تم دعامانگو تو ریاکاروں کی مانند نہ ہو۔ کیونکہ وہ عبادتخانوں اور بازاروں کے موڑوں پر کھڑے ہوکر دعا مانگنی پسند کرتے ہیں۔ تاکہ لوگ انہیں دیکھیں ۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں ۔ کہ وہ اپنا اجر پاچکے۔ بلکہ جب تو دعا مانگے تواپنی کوٹھڑی میں جا اور دروازہ بند کرکے اپنے باپ سے جو پوشیدگی میں ہے دعامانگ۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دیگا"(متی ۶: ۵تا ۶)۔ دعا کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے آسمانی باپ کے ساتھ رفاقت رکھیں نہ دکھلاوے کی خاطر اللہ کا نام رٹا کریں۔ کوئی بیٹا صرف دوسروں کودکھلانے کی خاطر اپنے باپ سے باتیں نہیں کرتا۔ توپھر ہم کیوں خدا باپ کے ساتھ خلوص نیت سے رفاقت نہ رکھیں ؟ ریاکاری کی دعا درحقیقت ایک دام تزویرہے جس میں آدمی پھانسے جاتے ہیں۔ریاکارخدا کی آڑ میں آدمیوں کا شکار کرتے ہیں وہ ان کے پاس" بھیڑوں کے بھیس میں آتے ہیں ۔ لیکن باطن میں پھاڑنے والے بھیڑئیے ہیں "(متی ۷: ۱۵) ریاکار درحقیقت نقال (ایکٹر)ہیں جو دنیا کی نمائش گاہ پر راستبازوں کا سوانگ بھرکے اپنے سامعین سے واہ واہ کے نعرے سن کر خوش ہوتے ہیں۔ اور خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔ یہ لوگ" اپنا اجر حاصل کرچکے "۔ ان کا طلسم نظر فریب ہے۔ وہ خوش عقیدہ لوگوں کو الو بناتے ہیں ۔لیکن حقیقی راستباز اس طرح خدا کا مضحکہ نہیں اڑاتا۔ وہ محض دکھلاوے اور عبادت نمائی کی خاطر خدا سے دعا نہیں مانگتا بلکہ " اپنی کوٹھڑی میں " جا کر"

[26] Headlam, Life and Teachings of Jesus Christ p.228.

دروازہ بند کرکے" دل سوزی مستعدی اورخلوص نیت سے خدا کے ساتھ رفاقت رکھتاہے۔

کلمتہ اللہ کی تعلیم سے نماز کی ظاہری رسوم کی ادائیگی کا عنصر کلیتہً غائب ہے۔ آپ کی تعلیم صرف اعلیٰ تریں روحانی اصول پر ہی مشتمل ہے یہودیت میں اسلام اور ہندومذہب کی طرح ظاہری رسوم کی بھرمار تھی۔ اس مذہب کے مطابق خدا ایک سلطان تھا۔ اور جس طرح سلطانی دربار میں آداب ومراسم ملحوظ رکھنے پڑتےہیں۔ اسی طرح ظاہری رسوم کی ادائیگی یہودیت کا جزولاینفک تھی۔ لیکن جس خدا کی کلمتہ اللہ نے تعلیم دی اس کا تعلق ظاہری رسوم سے رتی بھر نہ تھا۔ کلمتہ اللہ نے فرمایا" سچے پرستار باپ کی پرستش روح اور سچائی سے کرینگے۔ کیونکہ باپ اپنے لئے ایسے ہی پرستار ڈھونڈتا ہے خدا روح ہے اور ضرور ہے کہ اس کے پرستار روح اور راستی سے پرستش کریں"(یوحنا ۴: ۲۳ تا ۲۴)۔

(۴)

روزہ

سطورِ بالا میں ذکر ہوچکا ہے کہ روزہ ہر متقی وپرہیزگار یہودی ی کی زندگی کا حصہ تھا۔اہلِ یہود کو موسوی شریعت میں صرف ایک روزے کا حکم تھا، یعنی کفارہ کا روزہ (توریت شریف، احبار رکوع 16 آیت 29، رکوع 23آیت 27)لیکن سیدنا مسیح کے ایام میں پانچ یا چھ پبلک روزے تھے۔ان کے علاوہ راسخ الاعتقاد یہودی ہفتہ میں دو دون روزہ رکھتے تھے،(انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت لوقا رکوع 18رکوع 12) یعنی جمعرات کے روز جب امام کہتے تھے کہ حضرت موسیٰ کوہِ سینا پر گئے تھےاور سوموار کے روز جب ان ربیوں کے مطابق وہ پہاڑ پر سے اترے تھے۔ یہ روزے فرض نہ تھے لیکن یہودی ان کو مزید ثواب حاصل کرنے کے لئے رکھتے تھے، اور ان کو جو روزہ دار نہیں تھے وہ ملامت کا نشانہ بناتے تھے (انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت مرقس رکوع 2آیت 18)۔ روزہ کےدن وہ اپنے سروں پر راکھ ڈالتے تھے اور منہ نہیں دھوتے تھے، بلکہ ان کوڈھانپ لیتے تھے تا کہ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں۔یہودی امام ربی یشوع بن حنانیاہ کی بابت لکھا ہے کہ اس کا چہرہ روزہ داری کی وجہ سے تمام عمر کالارہتا تھا، کیونکہ وہ اپنے منہ پر راکھ ڈالے رکھتا تھا۔ [27]

اسلام میں بھی روزہ فرض ہے، قرآن شریف کے مطابق ماہ رمضان میں سحر سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے سے پرہیز کرنا لازم ہے، (سورہ بقرہ آیت 23) جس طرح اہل یہود روزہ کے دن ظاہری رسوم کو ادا کرتے تھے اسی طرح اہل اسلام کے لئے ماہ رمضان وبال جان ہوجاتا ہے۔

جناب مسیح نے حکم دیا کہ روزہ میں منافقت کی آمیزش بالکل نہ ہو۔ آپ نے فرمایا "جب تم روزہ رکھو تومنافقوں کی طرح اپنی صورت اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ

---

[27] Ibid.p.228.

اپنا منہ بگاڑتے ہیں، تاکہ لوگ انہیں روزہ دار جانیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پاچکے، بلکہ جب تم روزہ رکھو تو اپنے سر میں تیل ڈالو اور منہ دھو تاکہ آدمی نہیں بلکہ تمہارا پروردگار جو پوشیدگی میں ہے تمہیں روزہ دار جانے۔ اس صورت میں تمہارا پروردگار جو پوشیدگی میں دیکھتا ہیں تمہیں اجر عطا فرمائیگا (انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت متی رکوع 6 آیت 16-18)

(۵)

خلوصِ نیت

کلمتہ اللہ ہر طرح کی ظاہرداری، عبادت نمائی اور ریاکاری کے جانی دشمن تھے۔ آپ نے بار بار فریسیوں کو ان کی ریاکاری کی وجہ سے ملامت کی اور اپنے شاگردوں کو خبردار کیا اور فرمایا کہ فریسیوں اور صدوقیوں کی ریاکاری کے خمیر سے ہوشیار رہنا۔(متی ۱۶: ۶)آپ نے اُن دین فروشوں فریسیوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ" اگر تمہاری راستبازی فقیہوں اور فریسیوں کی راستبازی سے زیادہ نہ ہوگی۔ تو تم آسمان کی بادشاہت میں ہر گز داخل نہ ہوگے "(متی ۵: ۲۰)سامعین کی نظروں میں یہ حکم سب سے بھاری اور مشکل معلوم ہوا ہوگا۔ کیونکہ یہودی ربیوں کے خیالات کے مطابق فقیہی اور فریسی مجسم راستبازی تھے اور عامتہ الناس کے لئے ان سے بڑھ کر ہونا تو درکنار ان کی طرح راستباز ہونا محال تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن منجئی عالمین ہر ایرے غیرے نتھوخیرے کو فرماتے ہیں کہ وہ ان سے بڑھ کر راستباز ہوں ۔ کیونکہ ان کی راستبازی خدا کی نظر میں ریاکاری کی وجہ سے وقعت نہیں رکھتی۔ کلمتہ اللہ نے دین فروش فریسیوں پر سے ان کی مصنوعی تقدیس کا پردہ ہٹادیا۔اوران کو بے نقاب کرکے فرمایا " اے فریسیو! تم پیالے اوررکابی کواوپر سے توصاف کرتے ہو لیکن تمہارے اندر لوٹ اور بدی بھری ہوئی ہے۔پہلے پیالے اوررکابی کو اندر سے صاف کرو تاکہ اوپر سے بھی صاف ہوجائیں اے ریاکارفقیہو اور فریسیو تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہوجو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتے ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں توراستباز دکھائی دیتے ہومگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو"(متی ۲۳: ۲۵تا ۲۸)۔

جس یونانی لفظ کا ترجمہ "ریاکار" کیا گیا ہے اس کے معنی نقال یا ایکٹر کے تھے [28]۔ پس سیدنا مسیح کی نظر میں فریسی اور عالم شرح نقال اور ایکٹر تھے۔ ان کے افعال ان کی باتیں، ان کے کپڑے تک نقالوں کے سے تھے(متی ۲۳: ۵) ان کی تمام زندگی ایک سوانگ تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کے لئے ٹھوکر کا باعث تھے۔ "وہ آسمان کی بادشاہت کو لوگوں پر بند" کردیتے تھے اور نہ آپ داخل ہوتے تھے اور نہ کسی کو داخل ہونے دیتے تھے(متی ۲۳: ۱۳) جس طرح ایکٹروں کے الفاظ کا تعلق ان کے دلی جذبات سے نہیں ہوتا۔ ویسے

[28] Seeley, Ecc.Homo Ch.11.

ہی فریسیوں کی زبان سے جو تعلیم نکلتی تھی ۔ وہ لوگوں پر اثر نہیں کرتی تھی۔(مرقس ۱: ۲۲) وہ فصیح اللسان خطیب اور طلیق اللسان واعظ تھے مگر ان کی قدر گراموفون کے ریکارڈوں سے زیادہ -------نہ تھی ۔ ان کی وعظیں ان کے ذاتی تجربہ پر مبنی نہ تھیں۔ ان کا جوش وخروش یکسر تصنع تھا اور یہ سوانگ اس واسطے رچایا جاتا تھا کہ لوگ ان پر اعتماد کرکے ان کے دام فریب میں مبتلا ہوجائیں عامتہ الناس کہتے تھے۔

جبہ دوستار و تسبیح اور واعظ واعظاں
ان دغابازوں کی ہم نے پارسائی دیکھ لی

(۶)

شاگردی کی شرطیں:

ریاکاری اورظاہرداری کا قلع قمع کرنے کے لئے سیدنا مسیح نے اپنےشاگردوں کے لئے سخت تریں معیار مقرر فرمائے۔ آپ نے علانیہ اقرار کولازمی قرار دیا اور فرمایا کہ "جو کوئی اس زناکار اور خطاکار پشت میں مجھ سے اور میری باتوں سے شرمائے گا ۔ ابن آدم بھی اس سے شرمائیگا۔ جو کوئی آدمیوں کے سامنے میرا انکار کرے گا ۔ میں بھی اپنے باپ کے سامنے جو آسمان پر ہے اسکا انکار کرونگا "(لوقا ۹: ۲۶۔ متی ۱۰: ۳۲تا۳۳) کلمۃ اللہ نے اس پر ہی کفایت نہ کی بلکہ فرمایا کہ آپ کی خاطر آپ کے پیروؤں کو انتہا درجہ کی مصیبت اور ذلت سہنی پڑیگی۔ خلوص نیت کو معلوم کرنے کے لئے نہ صرف اعلانیہ اقرار کی ضرورت ہے بلکہ صبر اور استقلال سے جوروظلم کی برداشت کرنا خلوصِ قلب کا بہترین ثبوت ہے۔ آپ کی بلاہٹ آپ کا وہ "چھاج" تھا جس سے آپ نے "کھلیان کو خوب صاف کیا"۔ اور گیہوں کو بھوسی سے جدا کردیا (متی ۳: ۱۲)دنیادار اور ریاکار انسان ایذا رسانی کی برداشت نہیں کرسکتا کیونکہ اس کا اعلانیہ اقرار دلی جذبات کے مطابق نہیں ہوتا۔ لیکن جو شخص اپنے دلی جذبات کی خاطر ہر طرح کی قہر مانی مستقل مزاجی کے ساتھ برداشت کرنے کو تیار ہوتاہے۔ اسکے خلوص کی نسبت کوئی شخص شبہ نہیں کرسکتا۔ کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ دنیا کے لوگ آپ کے شاگردوں سے عداوت رکھیں گے (یوحنا ۱۵: ۱۹تا۲۰)۔آپ نے حواریوں کو مخاطب کرکے فرمایا "کیا تم گمان کرتے ہو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ نہیں۔ بلکہ جدائی کرانے، باپ بیٹے سے مخالفت رکھیگا اور بیٹا باپ سے ، ماں بیٹی سے اور بیٹی ماں سے ، ساس بہو سے اور بہو ساس سے مخالفت رکھے گی"(لوقا ۱۲: ۵۱تا ۵۲)پس جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتاہے وہ میرے لائق نہیں۔جو کوئی بیٹے یا بیٹی کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتاہے وہ میرے لائق نہیں"(متی ۱۰: ۳۷) آپ نے شاگردوں کو خبردار کیا اور فرمایا" خبردار ہولوگ تم کو عدالتوں کے حوالہ کریں گے ، تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کئے جاؤ گے ۔ لیکن جب لوگ میرے سبب تمہیں

لعن طعن کریں گے اور ستائیں گے اور ہر طرح کی بُری باتیں ناحق کہیں گے ۔ تو تم مبارک ہوگے"(متی ۱۰ : ۱۷، ۱۸، ۵: ۱۱)۔آپ نے علی الاعلان " سب سے کہا اگر کوئی میرے پیچھے آنا چاہے تو اپنی خودی سے انکار کرے اور ہر روز اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہولے۔ کیونکہ جو کوئی اپنی جان بچانی چاہے وہ اسے کھوئے گا ۔ اور جو کوئی میرے اور انجیل کے واسطے اپنی جان کھوئے وہی اسے ہمیشہ کی زندگی کے لئے محفوظ رکھے گا۔ آدمی اگر ساری دنیا کو حاصل کرلے اور اپنی جان کھودے تو اسے کیا فائدہ ہوگا؟"(لوقا ۹: ۲۳تا ۲۵۔ مرقس ۸: ۳۴تا۳۷۔ یوحنا ۱۲ : ۲۴تا ۲۶)۔

رسمِ عاشق نیست بایک دل دودلبر داشتن

یازجاناں یازجاں بالیست دل برداشتن

ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ حواریوں اور دیگر سننے والوں کے دلوں پر ان الفاظ کا کیا اثر ہوا ہوگا۔ وہ لوگ اس خیال میں تھے کہ مسیح موعود اقوام عالم پر فاتح ہو کر ان کو اپنا باجگذار بنائے گا اور اپنے پیروؤں کی اپنی بادشاہت میں عزت افزائی کرے گا (مرقس ۱۰ : ۳۷) مسیح مصلوب کا تصور ان کے لئے اجتماع نقیضین کی بہترین مثال تھا۔لیکن کلمۃ اللہ نے انکے خیالات کو صحیح کیا اور سیدنا مسیح نے ان کے سامنے نہایت صاف الفاظ میں شاگردی کی دو شرطیں پیش کیں جو ان کے وہم وگمان میں بھی کبھی نہ آئی تھیں آپ نے فرمایا کہ انسانی زندگی کا بہترین اور انسب مقصد آپ کی پیروی ہے اور سب سے گراں مایہ متاعِ حیات آپ کی محبت ہے۔ جس شخص کا دامن اس امتاع سے خالی ہے۔اس کا دعویٰ نجات وایمان دراصل بے دلیل ہے آپ کی پیروی میں دنیاوی عزت وحشمت ، شان وشوکت اورجاہ وجلال نہیں ملے گا ، بلکہ ،دکھ، تکلیف ، بے عزتی ، بے حرمتی، ایثار نفسی ، قربانی ، اپنی جان سے دشمنی بلکہ صلیب آپ کے پیروؤں کا حصہ ہوگی (متی ۲۰: ۲۳) ان کو آپ محبت کی پاداش میں ہف متاعن بنایا جائے گا۔ آپ نے اس حقیقت کو واضح کرنے کی خاطر اپنے شاگردوں کے سامنے دودنیاوی مثالیں بھی پیش کیں آپ نے فرمایا" تم میں ایسا کون ہے کہ جب وہ ایک بُرج بنانا چاہے ۔ توپہلے بیٹھ کر لاگت کا حساب نہ کرلے کہ آیا میرے پاس اس کے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں؟ ایسا نہ ہو کہ جب نیو ڈال کر تیار نہ کرسکیں تو سب دیکھنے والے یہ کہہ کر اس پر ہنسنا شروع کریں کہ اس شخص نے عمارت بنانی شروع کی ۔مگر تیار نہ کرسکا یا کون ایسا بادشاہ ہے جو دوسرے بادشاہ سے لڑنے جاتا ہو اورپہلے بیٹھ کر مشورہ نہ کرے کہ آیا میں دس ہزار سے اس کا مقابلہ کرسکتا ہوں یا نہیں جو بیس ہزار لے کر مجھ پر چڑھا آتا ہے؟ نہیں توجب وہ ہنوز دور ہی ہے۔ ایلچی بھیج کر صلح کی شرطوں کی درخواست کرے گا۔ پس اسی طرح تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کرے وہ میرا شاگرد نہیں ہوسکتا (لوقا ۱۴ : ۲۸تا ۳۳)سیدنا مسیح کا مطلب یہ ہے کہ دنیا دار شخص کسی کام کو ہاتھ لگانے سے پہلے اپنے نفع نقصان کو دیکھ لیتا ہے ۔ کیونکہ وہ کہتا ہے ۔ ع

چراکارے کند عاقل کہ بازآید پشیمانی

اسی طرح واجب ہے جو شخص منجئی عالمین کا شاگرد ہونا چاہے وہ یہ جان لے کہ بے عزتی اور تکلیف اس کا حصہ ہوں گی تاکہ بعد میں اس کو پشیمان نہ ہونا پڑے۔ کیونکہ " جو کوئی اپنا ہاتھ ہل پرر کھ کرپیچھے دیکھتاہے وہ خدا کی بادشاہت کے لائق نہیں" (لوقا ۹: ۶۲)

دماغ عشق نداری بہائے زلف مپرس

کہ ایں معاملہ باخاطر پریشاں نیست

(۷)

بزرگوں کی روایات اورالہیٰ احکام:

سطور بالامیں ذکر کیا گیاہے کہ فریسی، شریعت اور صحائف انبیاء کے علاوہ بزرگوں کی روایات پر عمل کرنا نجات کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ یہودی ربیوں کی تاویلیں اور تفسیریں فریسی مذہب کا جزواعظم تھیں۔ طالمود اس بات کا شاہد ہے کہ یہود اپنے ربیوں کی کتب اور بزرگوں کی روایات کی (جواُن مبنی تھیں) اتنی قدر کرتے تھے کہ وہ پرستش سے کسی طرح کم نہ تھی۔ انہوں نے اس امر میں اس قدرمبالغہ سے کام لیا کہ انہوں نے مشناہ اور گمرا یعنی اپنی روایات کی کتب کو توراتِ مقدس سے بھی چار قدم آگے بڑھادیا چنانچہ وہ کہتے تھے کہ تورات نمک کی طرح ہے لیکن مشناہ مرچ کی مانند اور گمراہ مصالحہ کی مانند ہے۔ تورات پانی کی طرح ہے لیکن مشناہ مے کی طرح گمرا خوشبو دار مصالحہ دار شراباً طھوراہے۔ تورات بدن ہے لیکن مشناہ نفس اورگمرازندگی کا دم ہے۔وہ کتاب مقدس کا پڑھنا بہت ضروری نہیں کرتے تھے لیکن مشناہ کا پڑھنا احسن شمار کرتے تھے اور گمراہ کا مطالعہ بہترین نیکی خیال کرتے تھے اورکہتے تھے کہ خود قادرِمطلق طالمود کے مطالعہ میں شب وروز مصروف رہتاہے[29]۔

اس کتاب پرستی نے ان کی عقلوں کو تاریک کررکھا تھا۔ سیدنا مسیح کا قول ان پر صادق آتا تھا کہ " اگروہ روشنی جو تجھ میں ہے تاریکی ہو توتاریکی کیسی بڑی ہوگی" ! (متی ۶: ۲۳) فریسی اپنے اندھے پن کے باعث رحم اور انصاف ، ایمان اور خدا کی محبت سے توغافل " تھے۔ لیکن بزرگوں کی روایات کو قائم رکھنے کے لئے "سونف اور پودیہ اورزیرہ اور سداُب" وغیرہ کی دہ یکی پر زور دیدے تھے (متی ۲۲: ۲۳۔ لوقا ۱۱: ۴۲) وہ اندھے راہنما تھے۔ " جو اونٹ کو نگل جاتے تھے لیکن مچھر کوچھانتے تھے۔(متی ۲۳: ۲۴)"وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر لادتے تھے۔ لیکن آپ ایک انگلی بھی ان بوجھوں کو نہیں لگاتے تھے (لوقا ۱۱: ۴۲) وہ کتبِ مقدسہ کے نہایت معمولی اورہلکے احکام کو اپنی روایات سے شدید اور بھاری بنادیتے تھے۔ مثلاً حکم تھا کہ بنی اسرائیل "اپنے پیراہنوں کے کناروں کوجھالر لگائیں۔ اورآسمانی رنگ کا ڈورا اس پر لگائیں"۔ تاکہ آسمانی رنگ کا ڈورا دیکھ کر

---

[29] Farrar, Christ and the Oral Law.Expositor vol.5.p.230.

وہ آسمانی حکموں کو یاد کریں (گنتی ۱۵: ۳۷) فقیہوں نے اس آسان حکم کے گرد باریک قیود کی باڑیں لگادیں اور حکم دیا کہ ہر اسرائیلی پر فرض ہے کہ ہر وقت اور بالخصوص صبح کی دعا کے وقت دو تعویذ باندھے۔ایک بائیں ہاتھ کی کہنی پر کیونکہ وہ دل کے نزدیک ہے۔ اور دوسرا دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی پر باندھے تاکہ عقل کی نشست گاہ کے قریب رہے ۔سر کا تعویذ کالے بچھڑے کے چمڑے کا ہو۔ اوراس کے اندر چار خانے ہوں۔ جن میں خروج ۱۳: ۱تا ۱۰-۱۳: ۱۱تا ۱۶- استثنا ۶: ۴تا ۹- ۱۱: ۱۳- ۲۱لکھے ہوں۔ یہ آیات بچھڑے کی دم کے بالوں سے صرف باندھی جائیں ۔ تعویذ کے باہر دائیں بائیں حرف شین عبرانی زبان میں لکھا ہو۔ کیونکہ اس حرف سے خدا کا نام" شدائی " یعنی قادر مطلق شروع ہوتا ہے ۔ کہنی والے تعویذ میں صرف ایک خانہ ہو۔ جس میں مذکورہ بالاچار مقامات چار متوازی قطاروں میں لکھے ہوں۔ اورہر قطار میں سات سطریں ہوں۔ تعویذ خاص طریقہ سے باندھا جائے۔ اس کے بعد ڈوری تین دفعہ بازو کے گرد باندھی جائے اور پھر گانٹھ دی جائے۔ باندھنے کے ہر عمل کے وقت کے لئے خاص دعائیں مقرر تھیں۔ ان تعویذوں پر اس قدر زور دیا گیا کہ ربی کہتے تھے کہ خدا تعالیٰ خود یہ تعویذ پہنتا[30] ہے! کیونکہ لکھا ہے کہ " میں اپنی ہتھیلی اٹھاؤنگا۔ اور تو میرا پیچھا دیکھیگا"(خروج ۳۳: ۲۳) اس طرح یہودی ربی مبالغہ کرکے نہایت معمولی احکام کو" بھاری بوجھ " بنادیتے

[30] Ibid.p.224.

تھے۔ان کا مقولہ تھا کہ اگر کوئی شخص کہے کہ جھالر لگانے کا حکم تورات میں نہیں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ وہ صرف کتاب مقدس کے الفاظ کی بے حرمتی کرتا ہے۔ جن میں بعض ہلکے اور دیگر بھاری ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تعویذ میں چار خانوں کے بجائے پانچ ہونے چاہئیں تووہ مستوجب سزائے قتل ہوگا۔ کیونکہ وہ ربیوں کے الفاظ کی بے حرمتی کرتا ہے۔جو سب کے سب بھاری[31] ہیں۔ کیونکہ لکھاہے کہ " جو کوئی باڑ کی جھاڑی کو توڑتاہے ۔ اس کو سانپ ڈسِ جائیگا"(ایکلی ۱۰: ۸)۔

عوام الناس ان احکام کے مارے سہم جاتے تھے۔ بقول شخصے

جاؤ ہوتا ہے اور بھی خفقان
سن کے ناصح ، جناب کی باتیں

ظاہر ہے کہ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں کے نزدیک اگر خدا کے احکام بزرگوں کی روایات پوری کرنے میں رکاوٹ کا باعث ہوتے تو ان الہیٰ احکام کو بالائے طاق رکھ دینے میں یہودی ربیوں کو مطلق باک نہ تھا۔(مرقس ۷: ۱۱- متی ۲۳: ۱۶تا ۲۲)وہ کہتے تھے کہ ربیوں کے اقوال انبیاء کے اقوال سے زیادہ قابل قدر ہیں۔ کیونکہ لکھا ہے "وہ ان کو جو نبوت کرتے ہیں کہتے ہیں کہ نبوت مت کرو، وہ (یعنی ربی) نبوت کریں گے"(میکاہ۲: ۶، ۱۱) کیونکہ انبیاء اور ربی دو قاصدوں کی مانند ہیں۔ جن کو کوئی بادشاہ کسی صوبہ دار کی طرف

[31] Ibid.pp.227-231.

بھیجے۔ ایک کی نسبت بادشاہ کہتاہے کہ ج وہ اس دستار اور انگشتری نہ دکھائے اس کی مت سنو۔ اور دوسرے کی نسبت حکم دیتاہے کہ ان کی بغیر کسی ظاہری نشان کے سنو۔ اسی طرح انبیاء کی نسبت تو خدا فرماتاہے کہ وہ " کوئی نشان یا معجزہ دکھائے"(استثنا ۱۳ : ۱) لیکن ربیوں کی نسبت خدا فرماتاہے کہ شریعت کے فیصلے کے موافق جووہ تجھے سکھائیں اوراس کے حکم کے مطابق جو وہ تجھے دیں کراور اس فیصلے سے جو وہ تجھ پر ظاہر کریں دہنے یا بائیں مت مڑ"۔(استثنا ۱۷ : ۱۱) جس سے ظاہر ہے کہ ربیوں نے الہیٰ معرفت کی کنجی چھین لی تھی۔وہ خود داخل نہیں ہوتے تھے۔ اور داخل ہونے والوں کو بھی روکتے تھے"(لوقا ۱۱ : ۵۲) کلمۃ اللہ ان تمام باتوں مثلاً طہارت، غسل، ظاہری رسوم کی ادائیگی ، اور بزرگوں کی روایات وغیرہ وغیرہ کو لاحاصل اورانکے سرانجام دینے کوسعی باطل تصور فرماتے تھے۔آپ کی یہ تعلیم تھی۔ کہ خداظاہری افعال کو نہیں دیکھتا بلکہ اندرونی جذبات کو دیکھتاہے جوان افعال کے محرک ہوتے ہیں۔آپ نے باطنی جذبات کو مقدم اور ظاہری افعال کو موخرقرار دےدیا۔ فریسیوں کے ظاہری اعمال پرہیزگاروں متقیوں اور پارساؤں کے سے تھے۔ لیکن یسعیاہ نبی کا کلام ان پر صادق آتا تھا کہ" یہ امت زبان سے تومیری عزت کرتی ہے۔مگران کا دل مجھ سے دور ہے اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتےہیں"(یسعیاہ ۲۹ : ۱۳، متی ۱۵ : ۷)۔ وہ شرعی الفاظ کے ایسے گرویدہ تھے۔ کہ ان روحانی حقائق کو فراموش کرگئے۔ جوان الفاظ میں ملبوس تھے۔ انہوں نے ظاہرداری اوراحکام کی بجاآوری کو توپیش نظر رکھا۔لیکن الہیٰ منشا کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ عرفی ایک قصیدے میں ایسے لوگوں کوخطاب کرکے کہتاہے۔

خرددرآدمی، ونگہ توشان قددرخ سنجی
ہمادرآشیاں ونگہ توفرآشیاں بینی
بہ خون آلودہ دست وتیغ غازی ماندہ بے تحسین
تواول زیب اسپ وزینت برگستواں بینی

(۱)

سبت کے احکام

موسوی شریعت میں حکم تھا کہ " توسبت کا دن پاک رکھنے کے لئے یاد کر۔ چھ دن تک تو محنت کرکے اپنے سارے کام کاج کر،لیکن ساتواں دن خداوند تیرے خداکا سبت ہے۔ اس میں کچھ کام نہ کر" (خروج ۲۰ : ۸تا ۱۰)الہیٰ منشا اس صحت بخش حکم سے یہ تھاکہ انسان اپنی مدت العمر پیٹ کی غلامی میں نہ کاٹے بلکہ جسم اور روح دونوں کو آرام دے۔اور اس حقیقت کو محسوس کرے۔ کہ " انسان فقط روٹی ہی کھانے سے جیتا نہیں رہتا ہے بلکہ ہربات سے جو خداوند کے منہ سے نکلتی ہے جیتا رہتاہے "(استثنا ۸ : ۳)فریسیوں نے اس الہیٰ منشا کو توپس پشت پھینک دیا اورحکم کی ظاہری بجا

آوری میں اس قدر مبالغہ کیا- اور اس حکم کو بزرگوں کی روایات کی زنجیروں میں اس قدر جکڑا کہ اس حکم کا ماننا وبالِ جان ہوگیا[32]۔ سبت انسان کی خاطر نہ رہا بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسان سبت کو ماننے کی خاطر پیدا کیا گیا ہے۔ اہلِ یہود کے نزدیک سبت کا حکم اس قدر زبردست تھا ۔ کہ خدا اس کو آسمان پر مانتا تھا(یوبلی ۲: ۱۸) پس حکم تھا- کہ جو سبت نہ مانے وہ جان سے مارا جائے (گنتی ۱۵ : ۳۵) سبت کے روز آگ جلانا ، روٹی پکانا ، گوشت اُبالنا، لکڑیاں جمع کرنا وغیرہ سب ممنوع تھے۔(خروج ۳۵: ۳۔ گنتی ۱۵ : ۳۲)۔

عہد عتیق کی کتب کے لکھے جانے کے بعد فقیہوں نے "کام" کو ایک کم چالیس مختلف انواع میں تقسیم کردیا ۔ ہر نوع کے ماتحت ایک کم چالیس "کام" تھے[33]۔ ذیل میں اُن انتالیس انواع میں سے چند درج کی جاتی ہیں:

(۱) بیج بونا، (۲) چرخہ کاتنا، (۳) دورسیوں کا بٹنا، (۴) دودھا گوں کا جدا کرنا (۵) آگ بجھانا، (٦) بوجھ اٹھانا، (۷) گانٹھ کا کھولنا، (۸) دو خط لکھنا وغیرہ۔

ان مختلف انواع میں سے ہر نوع انتالیس کاموں پر مشتمل تھی ۔ مشتے نمونہ ازخروارے ان " کاموں" کی مثالیں یہ ہیں۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ کوئی درزی جمعہ کی شام کو سوئی اپنے پاس نہ رکھے۔ تاکہ وہ بھول کر کہیں سبت کے روز بھی (جو جمعہ کی شام سے شروع ہوجاتا تھا) اس سوئی کو نہ اٹھاتا پھرے۔ گوشت، پیاز اور انڈے جمعہ کی شام سے پہلے بھون لینے چاہئیں۔ چراغ کو شفق سے پہلے جمعہ کی شام کو جلالینا چاہیے۔ کسی شخص کو سبت کے روز نصف میل سے زیادہ چلنے کی اجازت نہ تھی۔ اگر کسی کے دانت میں درد ہوتا تو سبت کے روز اس کو کلی کرنے کی ممانعت تھی ۔ کسی بیمار کو جب تک وہ قریب المرگ نہ ہو۔ علاج کرانے کی اجازت نہ تھی۔اگر کسی بچے کو چوٹ لگے اور اس کی ہڈی ٹوٹ جائے یا ہڈی اپنی جگہ سے سرک جائے تو حکم تھا کہ جب تک جان کا خطرہ نہ ہو اس کو کسی قسم کی امداد نہ دی جائے ۔ حکم تھا کہ کوئی عورت سبت کے روز اپنا منہ آئینہ میں نہ دیکھے۔ کیونکہ خدشہ تھا کہ اگر اس کو کوئی سفید بال دکھائی دے تو اس کو اکھاڑنے کی آزمائش میں نہ گر کر بال کو اکھاڑنے کا کام نہ کرے۔ سبت کے روز مچھر مارنا منع تھا- چارپائی سبت کے روز اٹھانی[34] منع تھی ۔ حکم تھا کہ اگر کوئی شخص سبت کے روز کسی شارع عام سے کوئی چیز اٹھا کر گھر لائے۔ یا گھر سے اٹھا کر کسی شارع میں لے جائے تو جماعت سے خارج اور سنگسار کیا جائے۔ اگر سبت کے روز کسی شخص کے کان سے روئی گرپڑے تو وہ اس کو اٹھا کر کان میں نہ ڈالے ۔ کیونکہ یہ بوجھ کا اٹھانا ہوگا۔ اگر کسی شخص کے مصنوعی دانت منہ سے گرپڑیں تو ان کو اٹھا کر اپنی جیب میں رکھنا بوجھ کا اٹھانا ہوگا۔اس طرح احکام کی بال کی کھال نکالی جاتی ۔ اور مختلف یہودی ربی مختلف

[32] Dictionary of Christ and the Gosples, Vol2.Art. Sabbath. See also the Decalogue.*by* R.H.Charles pp.123.131.
[33] Encyclopedia Biblica Vol.4p.4175
[34] Westcott. Commentary on John.Ch.5. Verse8.

فتاوی صادر کرتے ۔ مثلاً اگر کسی کا حیوان گڑھے میں گر پڑے تو بعض ربی کہتے تھے ۔کہ اس کو نکالنے سے سبت کا حکم نہیں ٹوٹتا۔لیکن بعض کو تو ایسا سودا ہوگیا تھا کہ وہ کہتے تھے کہ چونکہ حیوان ایک بھاری بوجھ ہے۔ لہذا وہ سبت کے روز گڑھے سے نہ نکالاجائے ۔ بلکہ اس کے نیچے بھوسی وغیرہ ڈال دی جائے تا کہ وہ ڈوبنے سے محفوظ رہے۔ اوراس کو خوراک وہیں دی جائے۔ فریسیوں کے احکام ایسے سخت تھے کہ کوئی شخص سبت کے روز اپنی جان بچانے کی خاطر آلاتِ حرب اوراسلاح کا استعمال نہ کرے۔خونخوار بادشاہ انٹی او کس ایپی فینیز (Onti Ochus Epiphanies) نے دوسری صدی قبل مسیح میں اس حکم کا ناجائز فائدہ اٹھا کرایک ہزار غیر مسلح یہود کو سبت کے روز تہ تیغ کردیا تھا۔

صدوقی سبت کے معاملہ میں فریسیوں سے بھی زیادہ سخت تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر کوئی آدمی سبت کے روز گڑھے میں گرپڑے تو وہ ہر گز نہ نکالائے جائے۔ وہ ان قیود کےاس قدر پابند تھے ۔ کہ ان کا حکم تھا کہ کسی انسان کو سبت کے روز گڑھے میں سے نکالنے کے لئے سیڑھی اور رسہ بھی نہ لٹکایا جائے[35] ۔یہودی عالم مونٹی فیوری اس امر کا اقرار کرتاہے اور کہتاہے کہ یہودی ربی بڑی مسرت کے ساتھ سبت کے حکم کی بابت نہایت باریک بینی سے کام لیتے

[35] Beginnings of Christianity pt.1.vol.1p.436.

تھے۔ ان کے ذہن رسا کو بہت دور کی سوجھتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سبت کے گردلامحدود چھوٹی، ادنیٰ ہیچ اور بے مایہ قیود کا جمگھٹا بندھ گیا۔[36]

کلمۃ اللہ نے یہ تعلیم دی کہ احکام کی بجاآوری میں کسی حکم کے الفاظ کو نہیں۔ بلکہ اس الہیٰ منشا کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ جس کی وجہ سے وہ حکم دیا گیا تھا۔ احکام کے محض الفاظ پر عمل کرنے سے ان کا اصلی منشا فوت ہوجاتاہے ۔ ہم کو صرف وہ روحانی حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے جوان احکام کی علت غائی ہے(استثنا ۵: ۱۴، ۱۵، متی ۱۵: ۳- ۲۰- ۲۳: ۱۳تا ۳۳)۔ چنانچہ آپ کی تعلیم کے مطابق انسان کی خیر خواہی اورہمدردی احکام کے محض الفاظ کی بجاآوری پر مقدم ہے۔

انجیل شریف میں چھ ایسے موقعوں کا ذکر ہے۔ جب سبت کی قیود کی بابت کلمۃ اللہ میں اور فریسیوں میں کشمکش ہوئی ۔آپ نے ایک موقعہ پر فرمایاکہ "سبت انسان کی خاطر بنا ہے نہ انسان سبت کی خاطر(مرقس ۲: ۲۷)اوریہی سبت کے حکم کا حقیقی منشا تھا۔ کہ انسان اپنی روزانہ محنت سے فارغ ہوکر روحانی قواء کی نشوونما حاصل کرسکے۔ اوراپنے پروردگار اورخدا کے ساتھ رفاقت رکھ سکے۔لیکن جب عبادت خانوں میں سبت کے روز یہودی جمع ہوتے تھے ۔ تووہاں دعایا نماز وغیرہ نہیں ہوتی تھی[37]۔ کیونکہ عبادت خانوں کا اصلی

[36] Montefiore. Religious Teachings of Jesus.p.34.
[37] Encyclopedia Biblica vol.4.p.4176

مقصد نماز اور دعا نہیں تھا۔ بلکہ شریعت کی تعلیم تھی۔ یہودی ربیوں نے عبادتخانوں کو درسگاہیں بنارکھا تھا۔ پس دینی اوردنیاوی نقطہ نگاہ سے سبت کا روز لوگوں کے لئے وبالِ جان ہوگیا تھا۔ اس سبت پرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہودی ربی سخت دل ہوگئے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے۔ کہ سبت کے روز کسی مریض کو جب تک وہ قریب المرگ نہ ہو تندرست کرنا روا نہیں (لوقا ۶: ۶۔ مرقس ۳: ۲)اس سے ہم ان کی سخت دلی اور بے رحمی کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ اسی سخت دلی کی وجہ سے سیدنا مسیح ان سے خفا ہوتے تھے۔آپ نے ان سے دریافت کیا" کیا سبت کے دن نیکی کرنا روا ہے یا بدی؟ جان کو بچانا یا قتل کرنا (مرقس ۳: ۴)جب انہوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ توآپ نے " ان کی سخت دلی کے سبب غمگین ہو کر چاروں طرف غصے سے نظر کرکے"(مرقس ۳ :۵)ان سے پوچھا " تم میں سے ایسا کون ہے جس کی ایک ہی بھیڑ اور وہ سبت کے دن گھڑے میں گرجائے۔ اور وہ اسے پکڑ کر باہر نہ نکالے؟ پس آدمی کی قدر تو بھیڑ سے بہت زیادہ ہے۔ اس لئے سبت کے دن نیکی کرنا روا ہے"(متی ۱۲: ۱۱تا ۱۲)کلمۃ اللہ کا غصہ ایسے مذہبی پیشواؤں پر بھڑکتا تھا جو مذہب کی آڑ میں سنگدلی کو جائز قرار دیتے تھے۔ اورمذہبی اصول کو اپنی بے رحمی کے لئے جائے پناہ بنا کر مسرت حاصل کرتے تھے۔ اور دین کی آڑ میں ذاتی منفعت کی تلاش میں رہتے تھے۔ ایک موقعہ پر " عبادت خانہ کے سردار نے اس لئے کہ سیدنا مسیح نے سبت کے دن شفا بخشی لوگوں سے خفا ہو کر کہا۔ چھ دن ہیں۔ جن میں کام کرنا چاہیے۔ پس انہی میں آکر شفا پاؤ نہ کہ سبت کے دن"(لوقا ۱۳: ۱۴)جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریض سیدنا مسیح کے پاس غروب آفتاب کے بعد شفا پانے آتے تھے۔ جب کلمۃ اللہ کے اس رویہ کے باعث فریسی حلقوں میں قیامتِ صغریٰ برپا ہوگئی۔ توآپ نے فریسیوں کو مخاطب کرکے فرمایا "۔ تم میں سے ایسا کون ہے جس کا گدھا یا بیٹا یا بیل کنوئیں میں گرپڑے اور وہ سبت کے دن فوراً نہ نکال لے" (لوقا ۱۴: ۵) آپ نے فرمایا کہ خدا سبت کے روز بھی کام کرتا ہے اس کی پروردگاری سبت کے روز بند نہیں ہوجاتی (یوحنا ۵: ۱۷) پس سبت کے آرام کا مطلب بے شغلی، کاہل الوجودی اور سستی نہیں اور نہ کھانا پینا نفیس کپڑے پہننا اورناچ رنگ میں مشغول رہنا ہے۔ جو یہود کا سبت کے روز معمول تھا[38]۔ اور جس کو وہ یسعیاہ ۵۸: ۱۳ کی رو سے صحیح خیال کرتے تھے۔ بلکہ سبت کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس دن وہ کام کئے جائیں جو خدا کو پسند ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے فرمایا کہ سبت کے روز " میرا باپ کام کرتا ہے اور میں بھی کام کرتا ہوں "(یوحنا ۵: ۱۷) پس آپ فرماتے تھے۔ کہ آپ " سبت کے مالک" ہیں۔(مرقس ۲: ۲۸)۔

---

[38] See Bruce, Teaching of The Twelve.p.90

(ب) حرام حلال خوراک اور اشیا:

بزرگوں کی روایت کو سر انجام دینے کے لئے اور ظاہری رسوم کی ادائیگی کو برقرار رکھنے کے لئے فریسی ظاہری پاکیزگی اور طہارت پر زور دیتے تھے۔ پاک اور ناپاک خوراک کے قوانین ہم کو احبار باب گیارہ اور استثنا ۱۴: ۱ تا ۲۱ میں ملتے ہیں۔ لیکن اہل یہود کو ہمیشہ یہ خدشہ دامنگیر رہتا تھا۔ کہ مبادا وہ اپنے روزانہ کاروبار میں کسی ناپاک شے کو چھو کر ناپاک نہ ہوگئے ہوں۔ پس عالم شرح غسل وطہارت کے قوانین کو حجی ۲: ۱۲ تا ۱۳ سے استخراج کرکے ان پر بڑا زور دیتے تھے (یوحنا ۲: ٦)مثلاً اگر کوئی شخص سارا دن گھر میں بیٹھنے کی بجائے بازار جاتا۔ توجب وہ واپس آتا تواپنے ہاتھ ضرور دھوتا۔ کیونکہ وہ یہ خیال کرتا تھا کہ ممکن ہے کہ اس کے ہاتھوں نے کسی ناپاک شے یا شخص کو چھولیا ہو۔ نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ جس پانی سے جسم کو پاک کیا جائے وہ خود بالکل پاک ہو۔ کامل پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے پانی خاص طرز سے مختلف اعضا پر ڈالا جاتا ۔ جس طرح اہل اسلام وضو خاص طریقہ سے کرتے ہیں۔ اور یہ امور مذہبی فرائض شمار کئے جاتے تھے۔ طالمود کا ایک پورا باب ان ہدایات سے بھرا پڑا ہے اور دو مستقل رسالے غسل کے اور ہاتھ دھونے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظاہری پاکیزگی کا سودا یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ مختلف اشیاء بھی دھوئی جاتی تھیں کہتے ہیں[39]۔ کہ جب ربی عقیبہ آخری قید بھگت رہا تھا تواس کا ایک شاگرد اسکے لئے دھونے اورپینے کے لئے پانی لایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ داروغہ جیل کو پیاس لگی۔ تو وہ آدھا پانی پی گیا۔ اس پر شاگردنے عقیبہ کوکہا ربی۔ آپ کو شدت کی پیاس لگی ہے۔ اورآپ کے پاس پانی کم ہے آپ ہاتھ نہ دھوئیں ۔ اور پانی سے اپنی پیاس بجھالیں۔اس پر ربی عقیبہ نے جواب دیا کہ جو شخص بغیر ہاتھ دھوئے روٹی کھاتاہے ۔ وہ مستوجب قتل ہے۔ پیاس کی موت مرنا بزرگوں کی روایات کو توڑنے سے ہزاردرجہ بہتر ہے"۔ فریسیوں میں ظاہری پاکیزگی کا سودا اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ مختلف اشیاء کوبھی دھویا کرتے تھے۔ صدوقی مذاقیہ کہا کرتے تھے کہ یہ فریسی تب چین لیں گے ۔ جب وہ آفتاب کو بھی دھو کر پاک کرلینگے۔ان یہودی ربیوں کے مطابق آسمان کی ہوا بھی پاک نہ تھی۔ کیونکہ اگروہ غیر اقوام کے کسی ملک سے ارضِ مقدس کی طرف چلتی تووہ بھی ناپاک تصور کی جاتی۔ جوراستبازوں کے پھیپھڑوں کے اندر جانے کے لائق نہ تھی[40]۔ انہی امور کی طرف اشارہ کرکے انجیلی وقائع نگار لکھتاہے کہ" فریسی اور سب یہودی ، بزرگوں کی روایت پر قائم رہنے کے سبب جب تک اپنے ہاتھ کہنی تک دھو نہ لیں نہیں کھاتے۔ اور بازار سے آکر جب تک غسل نہ کرلیں نہیں کھاتے

[39] F.W.Farrar,Christ and the Oral Law Expositor.Vol.5.pp.215-17

[40] Bruce.The Teaching of The Twelve .pp.81-82.

اور بہت سی اور باتیں ہیں جو قائم رکھنے کے لئے بزرگوں سے انہیں پہنچی ہیں۔ جیسے پیالوں اور لوٹوں اور تانبے کے برتنوں کا دھونا (مرقس ۷: ۳تا ۴)۔

کلمۃ اللہ نے یہ تعلیم دی کہ کوئی شخص کسی " ناپاک " شے کو چھونے یا کھانے سے ناپاک نہیں ہوجاتا ۔ حقیقی راستبازی محض جسمانی غسل کرنے اور "ناپاک" خوراک کو ترک کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتی اور نہ باطنی پاکیزگی پیالوں اور لوٹوں اور تانبے کے برتنوں کے دھونے " سے حاصل ہوسکتی ہے۔آپ نے یہ اصول قائم کیا کہ " کوئی چیز باہر سے آدمی میں داخل ہو کر اسے ناپاک نہیں کرسکتی ۔مگر جو چیزیں آدمی کے اندر سے نکلتی ہیں وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہیں"(مرقس ۷: ۱۵) کیونکہ " جو کچھ منہ میں جاتا ہے وہ پیٹ میں پڑتا اور پاخانے میں نکل جاتا ہے مگر جو باتیں منہ سے نکلتی ہیں وہ دل سے نکلتی ہیں اور وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہیں ۔ کیونکہ بُرے خیال ، خونریزیاں ، زناکاریاں ، حرامکاریاں چوریاں جھوٹی گواہیاں ، بدگوئیاں دل ہی سے نکلتی ہیں ۔ یہی باتیں ہیں جو آدمی کو ناپاک کرتی ہیں مگر بغیر ہاتھ دھوئے کھانا کھانا آدمی کو ناپاک نہیں کرتا"۔(متی ۱۵: ۱۷تا ۲۰)اہلِ یہود جو ظاہری پاکیزگی اور حرام اشیاء سے نفرت رکھنے پر نازاں تھے اس اصول کو سن کر ناراض ہوگئے۔ کیونکہ وہ ان کی تعلیم کے عین متضاد تھا۔ کلمۃ اللہ نے ان کور باطنی اور بے بصری پر افسوس ظاہر کیا ۔ اور فرمایا " وہ اندھے ہیں اور اندھوں کو راہ بتانے والے ہیں۔ اگر اندھا اندھے کو راہ بتائیگا تو دونوں گڑھے میں گر پڑینگے"۔(متی ۱۵: ۱۴)

آپ نے ظاہری اور بیرونی پاکیزگی کے پودے کو جو آسمانی باپ نے نہیں لگایا تھا بلکہ " بزرگوں کی روائتوں" نے قائم کیا تھا بیخ وبن سے اکھاڑ ڈالا(متی ۱۵: ۱۳) کیونکہ ان روایات سے خدا کا اصلی منشا یعنی روحانی پاکیزگی فوت ہوتی نظر آتی تھی۔ حرام حلال خوراک کے قوانین پر عمل کرنا ، ہاتھ دھونا، غسل کرنا ، بزرگوں کی روایات پر عمل کرنا نسبتاً آسان بات تھی ۔ لیکن فروتن ہونا ، رحیم مزاج رکھنا۔ باطنی پاکیزگی حاصل کرنا محبت کرنا زیادہ مشکل اُمور تھے اوریہی باتیں خدا ان سے چاہتا تھا۔ لیکن فریسی اپنے بزرگوں کی روایات کو کورانا تلقید کرتے تھے اور یہ نہیں دیکھتے تھے کہ محض ان رسومات پر عمل کرنے سے وہ الہیٰ منشا کو پورا نہیں کرسکتے۔

بزرگوں کی روایات پر سختی کے ساتھ عمل کرنے کا بعض دفعہ یہ نتیجہ ہوتا تھا ۔ کہ شرع کے عالم، مفسلوں، ناداروں اور بیواؤں پر مظالم ڈھاتے تھے۔ دہ یکی دینے کے اصول اور دیگر ایسے اصولوں پر سختی سے کاربند ہو کر وہ" بیوہ عورتوں کے گھروں کو دبا بیٹھتے تھے "(لوقا ۲۰: ۴۷) حالانکہ ارشادِ خداوندی یہ تھا ۔ کہ " نیکوکاری سیکھو، انصاف کے پیروہو، مظلوموں کی مدد کرو، یتیموں کی فریادرسی کرو، بیوہ عورتوں کے حامی ہو"(یسعیاہ ۱: ۱۷وغیرہ) پس فریسی اپنے ربیوں اور بزرگوں کے احکام کو الہیٰ احکام پر ترجیح دے کر ان کو عملی طورپر منسوخ گردانتے تھے ۔ بے انصاف قاضی اور محصول لینے والے بھی لوگوں کو لوٹتے تھے لیکن ان میں اور فریسیوں میں یہ فرق تھا ۔ کہ وہ جانتے تھے کہ وہ خدا

کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ لیکن فریسی شرع کی آڑ میں ربیوں کی تعلیم پر عمل پیرا ہو کر یہ ناجائز کام کرتے تھے۔ اور اس امر کا اقبال نہیں کرتے تھے کہ وہ خدا کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ وہ "اندھے" تھے (متی ۲۳: ۲۶)جو" اپنی آنکھ کا شہتیر" نہیں دیکھتے تھے لیکن محصول لینے والوں کی" آنکھ کے تنکے" پر نظر کرکے ان کو"گنہگار" قرار دے کر خدا کی جماعت سے خارج کردیتے تھے۔ وہ اونٹ کو تونگل جاتے تھے لیکن مچھر کو چھانتے تھے(متی ۲۳: ۲۴)۔

اسی طرح اہلِ یہود اپنے بزرگوں کی دیگر روایات پر عمل کرکے خدا کے احکام کو باطل کردیتے تھے ۔ چنانچہ کلمتہ اللہ نے ان کو متنبہ کرکے فرمایا " خدا نے فرمایا ہے کہ باپ کی اورماں کی عزت کر اور جواپنے باپ یاماں کو بُرا کہے وہ ضرور جان سے مارا جائے ۔ مگر تم کہتے ہو کہ جو کوئی باپ یا ماں سے کہے کہ جس چیز کا تجھے مجھ سے فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ وہ خدا کی نذ ہوچکی تووہ اپنے باپ کی عزت نہ کرے پس تم نے اپنی روایات سےخدا کا کلام باطل کردیا"(متی ۱۵: ۴تا ۶)ایسے شرع کے عالموں اور معلموں پر جو بزرگوں کی روائتوں کو صحف سماوی پر ترجیح دیتے تھے۔ سیدنا مسیح نے افسوس ظاہر فرمایا۔ اوران کی روائتوں کی کم مائگی کی حقیقت ان پر یوں ظاہر فرمائی اور کہا " تم کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے توکچھ بات نہیں لیکن اگر مقدس کے سونے کی قسم کھائے تواس کا پابند ہوگا۔اے ! احمق اور اندھو کونسا بڑا ہے؟ سونا یا مقدس ۔ جس نے سونے کو مقدس کیا؟ اور پھر کہتے ہو۔ کہ اگر کوئی قربانگاہ کی قسم کھائے توکچھ بات نہیں۔ لیکن جو نذر اس پر چڑھی ہو اس کی قسم کھائے تواس کا پابند ہوگا۔ اے اندھو! کون سی بڑی ہے؟ نذر یا قربانگاہ جو نذ کو مقدس کرتی ہے ؟ پس جو قربانگاہ کی قسم کھاتاہے وہ اس کی اور سب چیزوں کی جو اس پر ہیں قسم کھاتاہے۔ اور جومقدس کی قسم کھاتاہے وہ اس کی اوراس کے رہنےوالے کی قسم کھاتاہے اور جو آسمان کی قسم کھاتاہے وہ خدا کے تخت کی اور اس پر بیٹھنے والے کی قسم کھاتاہے"(متی ۲۳: ۱۶تا ۲۳)۔

(ج)قربانی:

اہلِ یہود نے نذر اور قربانی کےاصول پر اس قدر زور دیا تھا کہ مذہب کی آڑ میں یہودی علمائے کرام دنیاوی مفاد کو مدِ نظر رکھنے لگ گئے۔ بیت اللہ میں تاجروں کی دکانیں تھیں۔جہاں بھیڑوں ،بیلوں ،کبوتروں وغیرہ کی قربانی گزراننے کے لئے خریدوفروخت ہوتی تھی۔یہودی امام اس تجارت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔یہود اس ارشاد خداوندی کو بھول گئے تھے کہ "میں قربانی نہیں بلکہ رحم زیادہ پسند کرتاہوں"

(بائبل شریف صحائف انبیاء صحیفہ حضرت ہوسیع علیہ السلام رکوع 6آیت 6)جب سیدنا مسیح نے دیکھا کہ قربانیوں کی وجہ سے بیت اللہ "تجارت کا گھر "بن کر "ڈاکوؤں کی کھو"ہوگیا ہے۔(انجیل شریف راوی بہ مطابق حضرت یوحنا علیہ السلام

رکوع 2 آیت 16) تو ابن اللہ (سیدنا مسیح) کی غیرت جوش زن ہوئی۔آپ نے "ان سب کو نکال دیا جو بیت اللہ میں خریدوفروخت کررہے تھےاور صرافوں کے تختے اور کبوترفروشوں کی تختیاں الٹ دیں"(انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت متی علیہ السلام رکوع 21آیت 12)اور فرمایا کہ "ان کو یہاں سے لے جاؤمیرے پروردگار کے گھر کو تجارت کا گھر نہ بناؤ۔"(انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت یوحنا علیہ السلام رکوع 2 آیت 16) پروردگار نے فرمایا ہے کہ "میرا گھر سب قوموں کے لئے عبادت کا گھر ہوگا، لیکن تم اسے ڈاکوؤں کی کھوہ بناتے ہو"(انجیل شریف بہ مطابق راوی حضرت مرقس علیہ السلام رکوع 11 آیت 17،18) پروردگار کا مقصد تھا کہ غیر یہودی اقوام کے فرزند بھی اس کے گھر میں حاضر ہو کر اس پر ایمان لانے کا موقع حاصل کرکے اس کے احسان ،رحم اور محبت کو پہچان سکیں۔ پروردگار کا حکم تھا کہ "میرا حکم ماننا قربانی چڑھانے سے اور شنوا ہونا مینڈھوں کی چربی سے بہتر ہے کیونکہ نافرمانی اور جادو گری برابر ہیں اور سرکشی کفر اور بت پرستی برابر ہے"(بائبل شریف 1 سموئیل رکوع 15 آیت 22،23) پروردگار نے فرمایا تھا کہ "میں تیرے گھر کا بیل نہ لونگا نہ تیرے باڑے کا بکرا ،کیا میں بیلوں کا گوشت کھاتا ہوں یا بکروں کا لہو پیتا ہوں۔ توشکر گزاری کی قربانیاں خدا کے آگے گزران ،"(زبور شریف رکوع 50 آیت 9–14)اس نے بنی اسرائیل کو کہا تھا کہ جس دن میں تمہارے باپ دادوں کو ملک مصر سے نکال لایا میں نے سوختنی قربانی اور ذبیحہ کی نسبت کچھ نہیں کہا اور حکم نہیں دیا۔ بلکہ ان کو میں نے اتنا ہی کہہ کے حکم دیا کہ میری آواز کے شنوا ہو اور میں تمہارا خدا ہونگا اور تم میرے لوگ ہوگے"(بائبل شریف صحائف انبیا صحیفہ حضرت یرمیاہ علیہ السلام رکوع 7 آیت 22–23)لیکن اس قوم کے رہنماؤں نے احادیث پر چل کر ان خداوندی احکام کو بلائے طاق رکھ دیااور ظاہری رسوم اور قربانیوں پر اس قدر زور دیا کہ خدا کی برگزیدہ قوم کی عبادت کا اصلی مقصد فوت ہوگیااور غیر یہود اقوام کو بھی خدائے واحد کی عبادت کرنے کا موقعہ نہ دیا گیا۔

باب دوم

حقوق العباد

فصل اول

(۱)

نفسِ انسانی کا احترام:

باب اول میں ہم ذکر کر چکے ہیں - کہ کلمۃ اللہ نے یہ تعلیم دی ہے کہ خدا ہمارا آسمانی باپ ہے - جواپنی محبت اور پروردگاری کی وجہ سے ہر فرد بشر کی خوراک، پوشاک اور دیگر حاجات کا انتظام کرتا ہے- آپ اس دنیا میں پہلے معلم تھے- جنہوں نے روئے زمین کی اقوام کو انسانی زندگی اور روح کی قدروقعت کا سبق سکھایا-

کلمۃ اللہ کی بعثت سے پہلے انسان کی بطور ایک خود مختار فرد کے کوئی ہستی نہ تھی- انسانی تاریخ میں پہلے پہل قبیلہ ایک ہستی تصور کیا جاتا تھا[41] اور کسی

[41] See Sir Henry Maine. The Ancient Law.11th ed.

فرد کی وقعت محض اس قبیلے کے ممبر ہونے کی وجہ سے ہوتی تھی - مثلاً وحشی اقوام میں قبیلے کی ہستی اور بقا اس کے ہر ممبر کا مقدم نصب العین تھا- اس کی اپنی ہستی کچھ نہیں ہوتی تھی-

دوسری ارتقائی منزل میں ہر فرد کسی ملک یا ریاست کا ممبر ہوتا تھا جس کی اپنی ذاتی ہستی کچھ نہ تھی- مثلاً افلاطون کے فلسفہ میں ملکی ریاست کی بہبودی ہر شخص کے لئے اعلیٰ ترین مطمع نظر ہے[42]-

تیسرے ارتقائی مرحلے میں انسان کسی خاص ذات یا خاندان کا شریک تصور کیا جاتا تھا - اوراس کی ہستی کی قدرومنزلت اس شراکت کے ساتھ وابستہ ہوتی تھی- مثلاً اہلِ ہنود کے درمیان ذات پات کا سلسلہ ہے اگر کوئی شخص اچھوت ذات کا ممبر ہے - تو خواہ اس کی ذاتی زندگی کیسی ہی پاکیزہ کیوں نہ ہو- وہ ناپاک اور اچھوت خیال کیا جاتا ہے-

چوتھی ارتقائی منزل میں انسان کی قدرومنزلت اس کی اپنی ذات پر منحصر ہوتی ہے- اس کی قدراور وقعت کسی خاص قبیلے یا ملک یا ذات یا خاندان کے ممبر ہونے کی حیثیت سے نہیں ہوتی- بلکہ اس کے اپنے خیالات، جذبات، اقوال اور افعال کی وجہ سے ہوتی ہے-

کلمۃ اللہ نے تاریخ عالم میں پہلی دفعہ نفس انسانی کی وقعت واحترام کا سبق دنیا کو سکھایا- آپ سے پہلے ستویقی فلسفہ کو کسی حد تک اور اپکوری فلاسفہ کو

[42] Plato's Repbulic.

اور اسیری کے بعد اہل یہود کو اس حقیقت کی جھلک ملی تھی۔ چنانچہ ان لوگوں کی تصنیفات میں نفس انسانی کی قدرومنزلت کا ذکر بھی کہیں کہیں آیا ہے۔ مثلاً عہدعتیق کی کتب میں خدا کے لئے لفظ" باپ" کہیں کہیں آیا تھا۔ لیکن وہاں لفظ" فرزند" اسرائیل کی تمام قوم کے لئے استعمال کیا گیا تھا(خروج ۴: ۲۳۔ یسعیاہ ۱: ۲۔ ہوسیع ۱۱: ۱وغیرہ)اسرائیل کے کسی فرد کے لئے لفظ "فرزند" کبھی استعمال نہیں ہوا۔ کیونکہ خدا تمام قوم اسرائیل کا" باپ" تصور کیا جاتا تھا نہ کسی خاص فرد کا۔ لیکن کلمتہ اللہ نے فرمایا کہ خدا دنیا کے ہر فرد کا باپ ہے۔ جو ہر فرد بشر سے لازوال محبت رکھتا ہے۔ کلمتہ اللہ سے پہلے کسی شخص نے بھی اس حقیقت پر ایسا زور نہیں دیا۔ جیسا انجیل شریف میں دیا گیا ہے۔آپ نے اس حقیقت کو حقوق العباد کا بنیادی پتھر قرار دیا۔ آپ کا راحت افزا پیغام ہر فرد بشر کے لئے تھا۔ تاکہ ہر ایک انسان کی نجات ہوجائے۔ آپ اس لئے آئے تاکہ ہر شخص زندگی پائے اور کثرت سے پائے (یوحنا ۶: ۱۷۔ ۶: ۳۵وغیرہ) آپ نے فرمایا کہ آسمانی باپ کی محبت ہر فرد بشر پر حاوی ہے۔ اس پروردگار عالم کے ہاں ہر شخص کے بال تک گنے ہوئے ہیں۔(متی ۱۰: ۳۰)اس کی مرضی کے بغیر بنی نوع انسان میں سے کسی ایک شخص کی زندگی میں بھی کوئی واقعہ خواہ وہ کیسا ہی خفیف کیوں نہ ہو پیش نہیں آتا۔ کلمتہ اللہ ہر شخص کو جو بنی نوع انسان کے زمرہ میں شامل ہونے کا حقدار ہوسکتا ہے بلاتا ہے۔(متی ۱۱: ۲۸) اور اس کو کہتا ہے کہ اے فلاں تو خدا کا فرزند ہے اور تیری قدر نہ صرف ہوا کے پرندوں سے زیادہ ہے (متی ۶: ۲۶)بلکہ تمام دنیا سے بھی زیادہ ہے۔ (مرقس ۸: ۳۶)تیری روح ایک ایسی قیمتی شے ہے۔ کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کی جان اس کے بدلے فدیہ میں دے دی ہے۔(متی ۲۰: ۲۸۔ یوحنا ۱: ۳۰)۔

کلمتہ اللہ کی تعلیم کے مطابق ہر شخص کو خدا نے کوئی نہ کوئی قدرتی نعمت عطا کی ہے۔اور ہر انسان کا فرض ہے۔ کہ جو نعمت اور خداداد قابلیت اس کو ملی ہے اس کا وہ بہترین استعمال کرے۔ دنیا میں جس طرح کوئی دو شخص ایک دوسرے سے کامل طور پر شکل وصورت میں مشابہت نہیں رکھتے بلکہ ہر شخص کا خدوخال جدا ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں ہر ایک شخص کو جو پیدا ہوتا ہے خدا مختلف نعمتیں عطا فرماتا ہے۔

ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

کلمتہ اللہ نے فرمایا ہے کہ آسمانی باپ کی مرضی یہ ہے کہ ان خداداد قابلیتوں کا بہترین استعمال کیا جائے۔ اس دنیا میں ہر شخص الگ کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ جس کو صرف وہی احسن طور پر سرانجام دے سکتا ہے۔

ع ہر کسے را بہر کارے ساختند

اس کام کو ہر شخص تب ہی سرانجام دے سکتا ہے۔ جب وہ اپنی خداداد قابلیت کا بہترین استعمال کریگا۔ پس ہر شخص کے لئے لازم ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ اس کو آسمانی باپ نے کیا نعمت عطا فرمائی ہے اور اس کا

پروردگار نے انتظام عالم میں کیا حصہ مقرر کررکھاہے۔ (۱کرنتھیوں ۱۲: ۴تا ۱۱)۔ وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں کسی قسم کی غفلت اور کوتاہی نہ کرے۔ کلمۃ اللہ نے اس حقیقت کو ایک تمثیل کے ذریعہ اپنے شاگردوں کے ذہن نشین کیا۔ اورفرمایا کہ " اس آدمی کا سا حال ہے جس نے پردیس جاتے وقت اپنے گھر کے نوکروں کو بلا کر اپنا مال ان کے سپرد کیا۔ اورایک کو پانچ توڑے دیئے۔ دوسرے کو دو اور تیسرے کو ایک یعنی ہر ایک کو اس کی لیاقت کے مطابق دیا اور پردیس چلا گیا۔ جس کو پانچ توڑے ملے تھے اس نے فوراً جا کر ان سے لین دین کیا اور پانچ توڑے اورپیدا کرلئے۔ اسی طرح جسے دو ملے تھے اس نے بھی دو اورکمائے۔ مگر جس کو ایک ملا تھا اس نے جا کر زمین کھودی اوراپنے مالک کا روپیہ چھپادیا۔ بڑی مدت کے بعد ان نوکروں کا مالک آیا اور ان سے حساب لینے لگا۔ جس کو پانچ توڑے ملے تھے وہ پانچ توڑے اور لے کرآیا اورکہا اے مولا! آپ نے پانچ توڑے مجھے سپرد کئے تھے۔دیکھئے میں نے پانچ توڑے اورکمائے۔اس کے ماالک نے اس سے کہا اے اچھے اور دیانتدار نوکرشاباش! تم تھوڑے میں دیانتدار رہے۔ میں تمہیں بہت چیزوں کا مختار بناؤں گا۔اپنے مالک کی خوشی میں شریک ہو۔ اور جس کو دو توڑے ملے تھے اس نے بھی پاس آکرکہا اے مولا! آپ نے دو توڑے مجھے سپرد کئے تھے۔ دیکھئے میں نے دو اور توڑے کمائے۔ اس کے مالک نے اس سے کہا اچھے اور دیانتدار نوکر شاباش! تم تھوڑے میں دیانتدار رہے۔ میں تمہیں بہت چیزوں کا مختار بناؤں گا۔ اپنے مالک کی خوشی میں شریک ہو۔ اور جس کو ایک توڑا ملا تھا وہ بھی پاس آکرکہنے لگا اے مولامیں آپ کو جانتا تھا کہ آپ سخت آدمی ہیں اورجہاں نہیں بویا وہاں سے کاٹتے ہیں اور جہاں نہیں بکھیرا وہاں سے جمع کرتے ہیں۔ پس میں ڈرا اور جاکرآپ کو توڑا زمین میں چھپادیا۔دیکھیں جوآپ کا ہے وہ موجود ہے۔اس کے مالک نے جواب میں اس سے کہا اے شریر اور سست نوکر! تم جانتے تھے کہ جہاں میں نے نہیں بویا وہاں سے کاٹتا ہوں اورجہاں میں نے نہیں بکھیرا وہاں سے جمع کرتا ہوں۔ پس تمہیں لازم تھا کہ میرا روپیہ ساہوکاروں کو دیتے تومیں آکر اپنا مال سود سمیت لیتا۔ پس اس سے وہ توڑا لے لو اور جس کے پاس دس توڑے ہیں اسے دےدو۔ کیونکہ جس کے پاس ہے اسے دیا جائے گا اور اس کے پاس زیادہ ہوجائے گا مگر جس کے پاس نہیں ہے اسے وہ بھی جو اس کے پاس ہے لے لیا جائے گا۔ (متی ۲۵: ۱۴تا ۳۰۔لوقا ۱۹: ۱۱تا ۲۷)۔

اس تمثیل کےذریعہ منجئی عالمین نے یہ تعلیم دی کہ اگر ہم خدا دادقابلیتوں کو خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرینگے تو ہم خدا کے وفادار بندے ہونگے ہم اس عقلمند اور دیانت دار داروغہ کی طرح ہونگے۔ جس کے مالک نے اسے نوکرچاکروں پر مقرر کیا۔ تاکہ"وہ انہیں ان کی خوراک مناسب وقت پر بانٹتا رہے؟ وہ نوکر مبارک ہے جس کا مالک آئے تو اسے ایسا ہی کرتے پائے۔میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنی ساری ملکیت کی دیکھ بھال کا اختیار اس کے سپرد کردے گا لیکن اگروہ نوکر اپنے دل میں یہ کہنے لگے کہ میرے مالک کے

آنے میں ابھی دیر ہے اور دوسرے نوکروں اور نوکرانیوں کو مارنا پیٹنا شروع کردے اور خود کھاپی کر نشے میں دھت رہنے لگے اور اس نوکر کا مالک، کسی ایسے دن جب کہ نوکر کو اس کے آنے کی امید نہ ہو اور کسی ایسی گھڑی جس کی اسے خبر نہ ہو، واپس آجائے تو وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کے ڈالے گا اور اس کا انجام بے ایمانوں جیسا ہوگا۔ لیکن وہ نوکر جو اپنے مالک کی مرضی کو جان لینے کے باوجود بھی تیار نہ رہے گا اور نہ ہی اس کی مرضی کے مطابق عمل کرے گا تو بہت مار کھائے گا۔(لوقا ۱۲: ۴۲تا ۴۷)۔

پس ہر شخص پر یہ فرض ہوگیا کہ وہ اپنی خداداد قابلیتوں کا بہترین استعمال کرے۔ کوئی شخص محض کسی قوم یا قبیلہ یا ذات کا فرد ہی نہیں بلکہ ہر انسان کے لئے پروردگار عالم نے انتظام عالم میں ایک گوشہ مقرر کررکھاہے۔ اور ایک خاص کام اس کے سپرد کررکھاہے۔ جس کو سرانجام دینے کے لئے وہ خلق کیا گیا ہے ۔ خدا نے اس کو اس کام کو سرانجام دینے کی قابلیت اور اہلیت بھی عطا کررکھی ہے ۔ ہر شخص اپنی اپنی قسمت کا مالک اور اپنے اپنے افعال کا ذمہ دار ہے اور ہر شخص اپنے کاموں کی جزا اور سزا پائیگا۔ اور منصفِ حقیقی کے سامنے اپنے خیال ، قول اور فعل کا ذمہ وار ہوگا(متی ۱۲: ۳۶۔ ۲۵: ۳۱تا ۴۶)۔ کلمۃ اللہ نے فرمایا " آدمی اگر ساری دنیا کو حاصل کرے اور اپنی جان کا نقصان اٹھائے تو اسے کیا فائدہ ہوگا؟ اور آدمی اپنی جان کے بدلے کیا دے؟"(مرقس ۸: ۳۶تا ۳۷)۔

کلمۃ اللہ نے ہر فردِ بشر کی قدرومنزلت پر زور دے کر بنی نوع انسان کی قدرومنزلت کو بڑھادیا ۔ اور یہی ایک امر آپ کی حقیقی عظمت کو ظاہر کرتا ہے اور آپ کی تعلیم کی صداقت پر دلالت کرتاہے۔ آپ نے فرمایا کہ سب سے بُرا وہ شخص ہے جو ادنیٰ ترین انسان کی روحانی ترقی میں رکاوٹ کا باعث ہوتاہے۔ آپ کے الفاظ نہایت وزن دار ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو کوئی ادنیٰ ترین انسان میں سے " کسی کو ٹھوکر کھلاتاہے ۔ اس کے لئے یہ بہتر ہے کہ ایک چکی کا پاٹ اس کے گلے میں لٹکایا جائے۔ اور وہ گہرے سمندر میں ڈبودیا جائے۔ خبردار ان چھوٹوں میں سے کسی کو ناچیز نہ جاننا۔ کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ آسمان پر ان کے فرشتے میرے آسمانی باپ کا منہ ہر وقت دیکھتے ہیں۔ تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے یہ مرضی نہیں کہ ان چھوٹوں میں سے ایک بھی ہلاک ہو"(متی ۱۸: ۶، ۱۰، ۱۴)۔

نیازارم زخود ہرگز دلے را
کہ می ترسم دردجائے تو باشد

بچوں کی منزلت

منجئی عالمین کی بعثت سے پہلے یونانی رومی دنیا میں بچوں کی مطلق پروا نہیں کی جاتی تھی۔ اسقاطِ حمل معیوب خیال نہ کیا جاتا تھا۔ ارسطو جیسے عظیم الشان فلاسفر نے اسے نہ صرف جائز قرار دیا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیا تھا ۔ کہ

جب ملک کی آبادی ایک مقررہ حد سے تجاوز کرجائے تو اس قاعدہ کو حکماً نافذ کرنا چاہیے۔ مشرک مصنفین کی کتب سے معلوم ہوتاہے کہ یہ رسم قبل از مسیح علانیہ بالعموم جاری تھی۔ مثلاً ہلیرین (Hilariun) اپنی بیوی کو ایک محبت آمیز خط لکھتا[43] ہے اوراس خط کے آخر میں اس کو نہایت عام اور سرسری طور پر ہدایت کرتاہے کہ اگر نوزائیدہ بچہ لڑکی ہو تو اس کو باہر پھینک دے۔ جس سے معلوم ہوتاہے کہ وہ کوئی غیر معمولی ہدایت نہیں دیتا۔ اسی طرح حکیم سینیکا(Seneca) لکھتاہے کہ " ہم کمزور اور بدصورت بچوں کو مروا ڈالتے ہیں۔ کیونکہ ہماری عقل ہم کو بتاتی ہے ۔ کہ مفید اشیاء کو غیر مفید سے جدا رکھنا چاہیے "۔ طفلِ کشی کی قبیح رسم تمام یونانی ، رومی دنیا میں رائج تھی۔ اور بغیر کسی تامل کےعلانیہ کی جاتی تھی۔ متروک اولاد کی تجارت کھلم کھلی رومی سلطنت کے کونہ کونہ میں کی جاتی تھی۔

کلمۃ اللہ نے دنیا کو بچوں کا احترام کرنا سکھایا۔ ایک دفعہ لوگ بچوں کو آپ کے پاس لائے تاکہ آپ " ان پر ہاتھ رکھ دعا مانگیں"(متی ۱۹: ۱۳) لیکن آپ کے حواریوں نے ان کو روکا۔آپ یہ دیکھ کر خفا ہوئے اور فرمایا کہ "بچوں کو میرے پاس آنے دو انہیں منع نہ کرو، کیونکہ خدا کی بادشاہت ایسوں ہی کی ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو کوئی خدا کی بادشاہت کوبچے کی طرح قبول نہ کرے ۔ وہ اس میں ہر گز داخل نہ ہوگا"(لوقا ۱۸: ۱۵ تا ۱۷)۔آپ نے بچوں کو " اپنی گود میں لیا۔ اوران پر ہاتھ رکھ کر انہیں برکت دی۔"(مرقس ۱۰: ۱۶)۔

ایک دفعہ منجئی عالمین نے ایک بچہ کو لے کر حواریوں کے درمیان کھڑا کیا اور اسے گود میں لے کر(مرقس ۹: ۳۶) شاگردوں کو فرمایا" اگر تم توبہ نہ کرو اور بچوں کی مانند نہ بنو تو آسمان کی بادشاہت میں ہر گز داخل نہ ہوگے۔ جو کوئی میرے نام پر ایسے بچوں میں سے کسی کو قبول کرتاہے وہ مجھے قبول کرتاہے اورجو کوئی مجھے قبول کرتاہے وہ مجھے نہیں بلکہ اسے جس نے مجھے بھیجا قبول کرتاہے لیکن جو ان چھوٹوں میں سے جو ایمان لائے ہیں۔ کسی کو ٹھوکر کھلاتاہے ۔ اس کے لئے یہ بہتر ہے۔ کہ ایک بڑی چکی کا پاٹ اس کے گلے میں لٹکایا جائے اور وہ گہرے سمندر میں ڈبودیا جائے "(متی ۱۸: ۳تا ۶ ۔ ۱۷: ۳) " کیونکہ تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے یہ مرضی نہیں کہ ان چھوٹوں میں سے ایک بھی ہلاک ہو(متی ۱۸: ۱۴)۔

کیا بچوں کے نفس کااحترام ان سے زیادہ پُرزور اور روشن الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے ؟ پس جائے تعجب نہیں کہ چھوٹے بچے اور لڑکے آپ پر فدا تھے۔ اور ہر جگہ آپ کا استقبال بڑے تپاک سے کرتے تھے۔(متی ۱۹: ۱۵)۔

---

[43] Findlay, Realism of Jesus p.28.

(۳)

حرُمت نسواں:

یونانی رومی دنیا میں عورتوں کی حیثیت نہایت پس تھی۔ یونانی بیویوں کی مدت العمر غلامی میں بسر ہوتی تھی[44]۔ وہ بچپن میں اپنے والدین کی، جوانی میں اپنے شوہروں کی اور بیوہ ہونے پر اپنے فرزندوں کی غلام اور تابعدار ہوتیں۔ سپارٹا کے قانون کے مطابق بوڑھے اور ضعیف القویٰ شوہروں پر لازم تھا۔ کہ وہ اپنی کم سن بیویاں نوجوانوں کے حبالہ نکاح میں دے دیں تاکہ فوج میں قوی سپاہیوں کی تعداد زیادہ ہو۔ رومی قانون کے مطابق[45] شوہر یا باپ خاندان کا افسر اعلیٰ تھا۔ اس کو اپنے بیوی بچوں پر کامل اختیار حاصل تھا۔ وہ جب چاہتا عورت کو اپنے گھر سے نکال سکتا تھا۔ بلکہ مابعد کے زمانہ میں تو اس کے اختیارات اس قدر وسیع ہوگئے تھے کہ اگرچہ وہ چاہتا تو بیوی کو قتل بھی کرسکتا تھا۔ عورتیں فرقہ ذکور کی آلۂ شہوت ہی تصور کی جاتی تھیں۔

اسلام نے بھی عورتوں کی حالت ناگفتہ بہ کررکھی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ " مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ اس لئے کہ اللہ نے ایک دوسرے پر فضیلت بخشی ہے"(سورہ نساء)شوہر اپنی بیوی کو مارپیٹ سکتا ہے ایک کے بجائے

[44] Fairweather, Jesus and the Greeks.p.151.
[45] Hobhouse, Morals in Evolution. Vol.1.ch.5.

دوسری بدل سکتاہے (سورہ نساء) وہ عورتوں کو طلاق دے سکتاہے لیکن عورتیں مردوں کو طلاق نہیں دے سکتیں۔ عورتیں مردوں کی کھیتیاں ہیں شوہر ایک ہی وقت میں چار چار بیویاں نکاح میں لاسکتا ہے اوران کے علاوہ لاتعداد لونڈیاں رکھ سکتاہے ۔(سورہ نساء)۔

اہل یہود کو احکام عشرہ میں یہ حکم تھا کہ " توزنا نہ کر"(خروج ۲۰: ۱۴) لیکن ابتدا سے لے کر مسیحیت کی آمد کے بعد کے زمانہ تک بھی اس حکم کا مفہوم نہایت محدود معنوں میں سمجھا جاتا تھا ۔ اہل یہود کے نزدیک اس حکم کے مطابق کسی منکوحہ عورت کے لئے اپنے خاوند کے علاوہ کسی غیر شخص کے ساتھ ناجائز تعلق رکھنا ہر حالت میں ممنوع تھا۔ لیکن کسی شادی شدہ مرد کے لئے اپنی بیوی کے سوا کسی دوسری عورت کے ساتھ تعلق رکھنا صرف خاص حالات میں ہی ممنوع تھا۔ اگر کوئی شادی شدہ مرد کسی غیر منکوحہ عورت کے ساتھ ناجائز تعلق رکھتا تو وہ اس حکم کے ماتحت زناکار شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ ہاں۔ اگر کوئی شادی شدہ مرد کسی غیر شخص کی منکوحہ بیوی سے ناجائز تعلق رکھتا تب وہ زانی شمار کیا جاتا تھا۔ اہلِ یہود کے نزدیک عورت بطور مال منقولہ خیال کی جاتی تھی۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی منکوحہ عورت پر ہاتھ ڈالتا۔ تو وہ پرائے شخص کی جائداد پر قبضہ کرتا تھا ۔ لیکن غیر منکوحہ عورات اس حکم سے مستثنےٰ تصور کی جاتی تھیں۔ کیونکہ وہ شادی کرکے کسی شخص کی جائداد کا حصہ نہیں بن چکی تھیں۔ پس ساتویں حکم کا تعلق درحقیقت ناپاکی اور شہوت پرستی کے ساتھ

نہیں تھا۔ بلکہ جائداد کی چوری اورڈاکہ زنی کے ساتھ کیونکہ عورت کا درجہ مال منقولہ کا تھا۔

بزرگوں کی روایات نے عورات کا یہ حال کردیا تھا کہ یہودی ربی شارع عام میں عورتوں سے بات کرنا تو درکنار ان کا سلام تک قبول کرنا بھی باعث ننگ خیال کرتے تھے۔ ان کا قول تھا[46] کہ یہ بہتر ہے کہ شریعت کے الفاظ جلادیئے جائیں۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ کسی عورت کو سکھائے جائیں۔ ان کی روزانہ عبادت میں یہ تھی [47]۔جواب ابھی عبادت خانوں میں کی جاتی ہے کہ" اے خدا تیرا نام مبارک ہو۔ کہ تونے مجھے عورت نہیں بنایا"۔ اور عورت ان الفاظ میں خدا کا شکر کرکے کہتی [48] ہے۔" اے خدا میں تیرا شکر کرتی ہوں کہ" تونے مجھے اپنی مرضی کے مطابق بنایا ہے"۔

لیکن منجئی عالمین نے خود اپنی زبانِ فیض ترجمان سے ایک سامری عورت کو یہ تعلیم دی (یوحنا ۴ باب) آپ کا نجات کا پیغام مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے یکساں تھا۔ آپ نے اپنی تعلیم میں عورتوں کا کئی دفعہ ذکر بھی کیا۔ انجیل سوم ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔آپ نے تائب گنہگار عورتوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے عوض ان کو الہیٰ محبت کا زندگی بخش پیغام سنایا۔ اوران کو الہیٰ مغفرت کا جانفزا مژدہ دیا۔(لوقا ۷: ۳۶تا ۵۰)۔آپ نے

بے شمار عورتوں کو شفا بخشی ۔(لوقا ۸ باب وغیرہ) آپ نے بخوشی تمام ان کی دعوت کوقبول کیا(لوقا ۱۰ : ۳۸تا ۴۲) عورتوں میں سے بعض آپ کی دلی دوست تھیں۔ (یوحنا ۱۱ : ۵) "بہتیری عورتیں" آپ کے پیغامِ نجات کی اس قدر گرویدہ تھیں کہ "اپنے مال سے" آپ کی اور آپ کے حواریوں کی "خدمت کرتی تھیں"۔(لوقا ۸: ۳)۔ آپ نے فرمایا کہ ہر عورت جو" آسمانی باپ کی مرضی پر چلتی ہے آپ کی بہن اورماں ہے"۔(مرقس ۳: ۳۵)۔

کلمۃ اللہ کی تعلیم صنفِ نازک کے حقوق کی ہمیشہ محافظ رہی ۔ اگر ہم بنی نوع انسان سے اپنی مانند محبت رکھینگے توان کی عزت کرینگے۔ اوران کے روح اور جسم دونوں کی قدر کرینگے۔ پس کلمۃ اللہ نے محبت کا اصول ایسا عالمگیر اور جامع مقرر کیا ہے ۔ جس نے عورتوں کی عزت اوران کے روح اور جسم دونوں کی منزلت کو ایک احسن شے قرار دیدیا ۔ کوئی شخص اس بات کو پسند نہیں کرتا ۔ کہ اس کی ماں بہن بیٹی یا بہو ، بیوی کو صرف آلہ شہوت بنا کر استعمال کیا جائے ۔ پس محبت کے ہمہ گیر اصول کے مطابق ہم ہر عورت کو اپنی بہن ، بیٹی کی مانند تصور کرینگے۔اور بُرے خیال ناشائستہ افعال سے احتراز کرینگے۔ بلکہ عورتوں کے روح اور جسم کو اپنی روح اور جسم کی طرح قابل قدر جان کر ان کی وقعت کرینگے۔

پس کلمۃ اللہ کی تعلیم نے عورتوں کو مردوں کے الہ شہوت ہونے سے بچالیا اورزناکاری اور عصمت فروشی کا سدباب کردیا۔ ربی حلیل نے طلاق کی

[46] Westcott, Commentary on John vol.1.p.12.
[47] Ibic.Vol.1.p.163.
[48] Glover ,Jesus of History .p.127

اجازت دے رکھی تھی۔ اس کا قول تھا کہ " مرد عورت کو نہایت معمولی غلطیوں کی وجہ سے طلاق دے سکتا ہے۔ مثلاً جب وہ روٹی جلائے ۔ تو مرد اپنی بیوی کو طلاق دے[49] دے۔ لیکن عورت کو یہ اختیار حاصل نہیں تھا۔ کہ مرد کو کسی حالت میں بھی طلاق دے سکے۔ پس طلاق کی گرم بازاری نے عورتوں کا درجہ پست کردیا تھا۔ ان پست خیالات نے شہوت رانی کو ترقی دے رکھی تھی۔ کلمتہ اللہ نے طلاق کو قطعی طور پر بند کردیا۔ فریسی ایک دفعہ کلمتہ اللہ کے پاس آئے۔ اور پوچھنے لگے۔" کیا یہ روا ہے کہ مرد اپنی بیوی کو چھوڑدے"؟آپ نے جواب میں فرمایا کہ خالق کا ابتدائی منشا یہ نہیں تھا ۔ کہ مرد اپنی بیوی کوطلاق دے۔ کیونکہ مرد اور عورت دو نہیں بلکہ ایک جسم ہیں۔ اس لئے جسے خدا نے جوڑا ہے اسے آدمی جدا نہ کرے"۔ (مرقس ۱۰: ۱ تا ۹)جب آپ کے شاگردوں نے پھر طلاق کی نسبت استفسار کیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ " جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑدے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ اس پہلی کے برخلاف زنا کرتا ہے اور اگر عورت اپنے شوہر کو چھوڑدے اور دوسرے سے بیاہ کرے تو زنا کرتی ہے"(مرقس ۱۰: ۱۱تا ۱۲)پھر فرمایا " جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑدے وہ اس سے زنا کراتاہے اور جو شخص شوہر کی چھوڑی ہوئی عورت سے بیاہ کرے وہ زنا کرتاہے "(متی ۵: ۳۲۔ لوقا ۱۶: ۱۸)۔

[49] Dictionary of Christ and the Gospels.vol.1.Art Divorce.

پس کلمتہ اللہ کی تعلیم نے فرقہ نسواں کو قعر مذلت سے نکال دیا اور عورتوں کی کایا پلٹ دی۔ یہاں تک کہ دنیائے اخلاق میں مردانہ فضائل کی بجائے نسوانی فضائل کو زندگی کا اعلیٰ ترین نصب العین قرار دے دیا۔ چنانچہ پروفیسر سیتھ (Seth) کہتا ہے کہ " مسیحیت نے جو عظیم الشان تبدیلی دنیائے اخلاق میں پیدا کردی ۔ وہ یہ ہے کہ اس نے تنگ اور مردانہ فضائل کی بجائے جو متقدمین کا نصب العین تھیں۔ نسوانی فضائل کو نیکی کا جوہر قرار دےدیا۔ ----۔ مسیحی فضائل کا دائرہ اب میدان جنگ نہ تھا بلکہ اب غربا کی مدد، بیماروں کی تیمارداری اور مظلوم ومتروک اولاد کی خبر گیری کرنا کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا[50] ۔ اسی طرح مورخ لیکی (Lecky) بھی کہتا ہے " مسیحیت کا ایک خاص کارنامہ یہ ہے۔ کہ اس نے اخلاقی تخیل میں تبدیلی پیدا کرکے فضائل نسوانی کو ایک خاص شرف وامتیاز عطا کردیا۔-----۔ یہ انقلاب حالت تمام تر مسیحیت کا نتیجہ تھا۔ جس نے قدیم یونانی (اور رومی) تخیل کو فنا کرکے اس کی جگہ حلم وانکسار ، خلق وتپاک، رفق ، ملاطفت ، تسلیم ورضا، الفت ومحبت کے جذبات مخصوص بہ نسواں کورفعت بخشی[51] ۔

[50] Seth, Ethical Principles .p.384. see also Murray, Pagan Religions At the Coming of Christianity in Peak's Commentary.pp.632.3

[51] Lecky,Hist of European Morals.(Urdu Trans).by Abdul Majid.vol2.pp.219-220

پس کلمۃ اللہ کی تعلیم صنف نازک کے حق میں آیہ رحمت ہے اس نے عورتوں کو وہ درجہ عطا کیا ہے جو ان کو کبھی نصیب نہ ہوا تھا اور جو اب ان سے چھن نہیں سکتا۔

فصل دوم

(۱)

اُخوت انسانی اور مسیحی نصب العین

کلمۃ اللہ نے تعلیم دی کہ خدا ہمارا آسمانی باپ ہے اور کل بنی نوع انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ آپ نے فرمایا " تمہارا باپ ایک ہی ہے۔ جو آسمان پر ہے اور تم سب بھائی ہو"(متی ۲۳: ۸تا ۹)۔

یہ پہلا سبق تھا کتاب ِ ھدا کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

کلمۃ اللہ سے پہلے انبیاء اللہ نے اس اصول کی روشنی کی جھلک دیکھی تھی ۔ لیکن کلمۃ اللہ اس دنیا میں پہلے معلم تھے۔ جنہوں نے خدا کی محبت وابوت اور انسانی اخوت کو اپنی تعلیم کا اصل الاصول بنایا۔ متقدمین نے اس اصول کی ایک جھلک پائی تھی ۔ لیکن کلمۃ اللہ نے اس اصول کو انسان کی روزمرہ زندگی کے فرائض کے ساتھ وابستہ کردیا۔ اور کل انسانی اخلاق کا نصب العین قرار دے دیا۔ دیگر انبیاء نے اس کو دھندلے اور مبہم طور پر ہی ظاہر کیا تھا۔ لیکن سیدنا مسیح نے اس اصول کو عالمگیر بنا کر اس کو کل بنی نوع انسان پر حاوی کردیا۔ جس طرح الہٰیٰ محبت سب پر حاوی ہے ۔ اسی طرح انسانی محبت بھی کسی خاص طبقہ یاقوم سے متعلق نہیں بلکہ عالمگیر ہے سیدنا مسیح نے انسانی اُخوت ومساوات پر نہ صرف بڑا زور دیا۔ بلکہ محبت کو اپنی تعلیم کا بنیادی پتھر بنا کر بار بار تاکید کرکے فرمایا "۔ میں تم کو ایک نیا حکم دیتا ہوں ۔ کہ ایک دوسرے سے محبت رکھو" جیسے میں نے تم سے محبت رکھی ۔ تم بھی ایک دوسرے سے محبت رکھو اس سے سب جانیں گے کہ تم میرے شاگرد ہو"(یوحنا ۱۳: ۳۴تا ۳۵- ۱۵: ۱۲تا ۱۴)۔

کلمۃ اللہ نے اخلاقی قوانین کو تمام رسوم اور قیود شرعیہ سے آزاد کرکے ان کو صرف ایک اصول یعنی اصول محبت کے ماتحت کردیا اس زریں اصول کے سوا آپ نے کوئی دوسرا اصول کبھی وضع نہ کیا۔ اور فرمایا کہ اس اصول پر" تمام توریت اور صحائف انبیاء کا مدار ہے "(متی ۲۲: ۴۰)آپ کی تعلیم کے مطابق محبت کا اصول آسمان اور زمین پر حاوی ہے۔ آسمان پر خدا ہے۔ جس کی ذات اور جس کا جوہر محبت ہے وہی اکیلا حقیقی منعم ہے ۔ اور زمین پر ایک ہی نعمت ہے ۔ جو قابلِ رشک ہے اور وہ محبت ہے جو ہم کو دوسروں کی خدمت کرنے کا فخر عطا کرتی ہے۔

یک منعم ویک نعمت ویک منت ویک شکر
صد شکر کہ تقدیر چنیں راند قلم را

یہی وجہ ہے کہ مقدس پولوس رسول لکھتاہے "پس آپس کی محبت کے سوا کسی چیز میں کسی کے قرضدار نہ ہو۔ کیونکہ جو دوسرے سے محبت رکھتاہے اس نے شریعت پر پورا عمل کیا۔ کیونکہ یہ باتیں کہ زنا نہ کر، خون نہ کر، چوری نہ کراوران کے سوا اور جو کوئی حکم ہو۔ ان سب کا خلاصہ اس بات میں پایا جاتا ہے۔ کہ اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ محبت اپنے پڑوسی سے بدی نہیں کرتی اس واسطے محبت شریعت کی تکمیل ہے"۔(رومیوں ۱۳ : ۸تا ۱۰)۔

فریسیوں نے روزمرہ زندگی کو لا تعداد قیود سے جکڑرکھا تھا۔ جن کو وہ راستبازی کے لئے ضروری خیال کرتے تھے۔ زندگی ان قیود کے "بھاری بوجھ" کے مارے ایک وبال ہوجاتی ہے۔ لیکن اگرہمارے دل میں خدا اور انسان کی محبت موجزن ہے۔ توزندگی بوجھ ہونے کی بجائے خوشی اورخرمی کا باعث ہوجاتی ہے۔ اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ان چھوٹے چھوٹے احکام کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ ہم خود بخود راستبازی کے ایسے کام کرینگے جو خدا اور انسان کے نزدیک مقبول ہونگے۔ کلمۃ اللہ کی تعلیم کی یہ خصوصیت ہے کہ محبت کے بنیادی اصول کی وجہ سے قوانین وقواعد یا احکام کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اگر ہماری "آنکھ درست" ہے (متی ۶ : ۲۴) توہماری ضمیر ہر موقع پر ہم کو بتادیتی ہے۔ کہ آیا فلاں کام خدا اورانسان کی محبت کے منافی ہے یا مطابق ہے۔ کلمۃ اللہ ان سب اشخاص کوملامت کرتے تھے۔ جومحبت کے اصول کا اطلاق اپنی روزمرہ زندگی کے افعال پر نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے دلوں میں انسانی محبت کی بجائے کسی اورشے کی محبت حکمران ہوتی ہے۔ لیکن اگرہم اور آدمیوں کے ساتھ ایسی محبت رکھینگے۔ جیسی ہم اپنے ساتھ کرتے ہیں۔ تواس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ہم ان کوکسی طرح کا گزند نہیں پہنچائینگے۔ خون، قتل، غصہ، زنا، شہوت پرستی، چوری، چغل خوری، عیب جوئی وغیرہ کا خود بخود سدباب ہوجائیگا۔ نہ صرف یہ باتیں خود بخود مٹ جائینگی۔ بلکہ ہم ہر ایک شخص کے ساتھ جوہمارے دائرہ اثر میں آئیگا۔ بہترین سلوک روا رکھینگے۔ پس کلمۃ اللہ نے لاتعداد قوانین کے بجائے ایک زندہ اصول قائم کردیا۔ جس پر عمل کرنے سے ہماری زندگی سے خود بخود تمام نیک افعال صادر ہوسکتے ہیں۔

کینن لڈن (Canon Liddon) ایک موقعہ پر کہتاہے۔ کہ اخلاقی قانون ازلی ہے۔ لیکن انجیل شریف میں یہ اخلاقی قانون کوئی بیرونی شکل اختیار نہیں کرتا بلکہ زندگی کا روحانی اور اندرونی اصول بن جاتا ہے[52]۔ محبت ایک ایسا نصب العین ہے۔ جوجامع اورمانع ہے۔ محبت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم ہر ممکن طور سے سر توڑ کوشش کریں کہ ہمارا پڑوسی بھی محبت کرنے والوں کے حلقہ میں داخل ہوجائے۔ مشہور فلاسفر پروفیسر رائس (Royce) کہتاہے۔ "

[52] Canon Liddon,Quoted by Anderson Scott in New Testament Ethics.p.21

محبت کا اولین کام یہ ہے کہ دوسرے شخص میں محبت پیدا کرے۔ اور تمام لوگوں کو محبت کی تعلیم دے کر آسمان کی بادشاہت کی حدود کو وسیع کردے[53]۔ محبت کی چنگاری دوسرے کےدل میں بھی محبت کی آگ لگادیتی ہے ۔ محبت سے بہتر نصب العین اور مطمع نظر عالم وجود یا عالم خیال میں آہی نہیں سکتا۔ جرمن شاعر ۔ گوئٹے (Goethe) نے کیاخوب کہا ہے کہ" خواہ ہمارا فہم ،انسانی ادراک اور روحانی ترقی کیسے ہی بڑےمعراج پر پہنچ جائیں۔وہ مسیح کی تعلیم کے اخلاقی جلال اور عروج سے (جس کی جھلک ہم کوانجیل شریف میں دکھائی دیتی ہے) آگے نہیں نکل سکتے۔[54]۔

خلل پذیر بود ہر دبنا کے مے بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

ایک عالم شرع نے کلمۃ اللہ سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کونسا حکم ہے۔آپ نے جواب میں فرمایا ۔ کہ "اول یہ ہے کہ تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اوراپنی ساری جان اور اپنی عقل اوراپنی ساری طاقت سے محبت رکھ ۔ دوسرا یہ ہے کہ تو اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ (مرقس ۱۲: ۳۰تا ۳۱) اس پر اس نے کلمۃ اللہ سے یہ پوچھا کہ میرا پڑوسی کون ہے جس سے میں اپنے برابر محبت رکھوں، سیدنا مسیح نے اس کا جواب ایک تمثیل میں دیا اور فرمایا" ایک آدمی یروشلم سے اریحا جارہا تھا کہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں جا پڑا۔ انہوں نے اس کے کپڑے اتار لئے اور اسے مارا پیٹا اور زخمی کردیا اور ادھ موا چھوڑ کر چلے گئے ۔ اتفاقاً ایک امام اس راہ سے جارہا تھا اس نے زخمی کو دیکھا مگر کترا کر چلا گیا۔ اسی طرح ایک خادم بیت اللہ بھی ادھر آنکلا اور اسے دیکھ کر کترا کر چلا گیا ۔ پھر ایک سماری جو سفر کررہا تھا وہاں آنکلا ۔ زخمی کو دیکھ کر اسے بڑا ترس آیا ۔ وہ اس کے پاس گیا اور اس کے زخموں پر تیل اور مے لگا کر انہیں باندھا اور زخمی کو اپنے گدھے پر بٹھا کر سرائے میں لے گیا اور اس کی تیمارداری کی۔ اگلے دن اس نے دو دینار نکال کر بھٹیارے کو دئیے اور کہا: اس کی دیکھ بھال کرنا اور اگرخرچہ زیادہ ہوا تو میں واپسی پر ادا کردوں گا ۔ تمہارے نزدیک ان تینوں میں کون اس شخص کا جو ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں جا پڑا تھا پڑوسی ثابت ہوا ؟ شریعت کے عالم نے جواب دیا : وہ جس نے اس کے ساتھ ہمدردی کی ، سیدنا عیسیٰ نے اس سے فرمایا جاؤ تم بھی ایسا ہی کرو۔(لوقا ۱۰ : ۳۰تا۳۷)۔

کلمۃ اللہ کا یہ مطلب ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص پرواجب ہے کہ وہ دوسرے کے ساتھ (خواہ وہ اس کے مذہب ، ملت یا طبقہ کا ہو یا نہ ہو) اپنے برابر محبت رکھے۔آپ نے سامری کو حقیقی پڑوسی قرار دیا۔ گوسامریوں میں اور اہل یہود میں سخت مخالفت تھی۔ (لوقا ۹: ۵۴)اہل یہود کے لئے جائز نہ تھا کہ کسی سامری کی مہمان نوازی قبول کریں۔ (یوحنا ۴: ۹)سامریوں کی گواہی

[53] Royce, Problems of Christianity vol.1.p.85.
[54] Quoted by Harnack, What is Christianity ?p.147

یہودی عدالتوں میں قابل اعتبار نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یہودی ربی کہتے تھے[55] کہ " کسی سامری کی روٹی کھانا خنزیر کے گوشت کھانے کے برابر " ہے ۔ لیکن ابن اللہ نے ایک سامری کو جس کو تمام یہودی بنظرِ حقارت دیکھتے تھے۔ (یوحنا ۸: ۴۸)۔ پڑوسی کا بہترین نمونہ قرار دیا۔

مساوات کی تعلیم یہود کی کتب مقدسہ میں نہ تھی۔ یہ کتابیں یہود اور غیر یہود میں قطعی طور پر تمیز کرتی تھیں۔ یہود میں بھی نفی کے طور پر مساوات کا اصول جائز تھا۔ چنانچہ توبت نے کہا تھا " جس چیز سے تجھے نفرت ہے وہ دوسرے کے لئے روا نہ رکھ "(۴: ۱۵) ربی حلیل نے کہا تھا کہ " جس شے کو تو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اس کو تو اپنے پڑوسی کے لئے روا نہ رکھ۔ تمام شریعت یہی ہے۔ باقی اس کی تفسیر ہے[56]۔ یعنی وہ کہتے تھے کہ " ہر چہ برخود مپسندی بردیگراں مپسند"۔ لیکن کلمۃ اللہ نے اصول مساوات کو یہود اور غیر یہود سب پر حاوی کرکے اس اصول کو اثباتیہ شکل دے دی اور فرمایا" جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں۔ وہی تم بھی ان کے ساتھ کرو"(متی ۷: ۱۲)۔

پس کلمۃ اللہ اس دنیا میں پہلے معلم تھے ۔ جنہوں نے اخوت انسانی کا سبق دنیا کو پڑھایا ۔ آپ سے پہلے کسی ملت کے مذہبی پیشوا نے یہ سبق نہیں دیا

[55] Westcott, Commentary on John.Vol.1.p.147
[56] Qouted by Headlam in Life and Teachings of Jesus Christ.p.82.

تھا۔ افلاطون کا فلسفہ اگرچہ اپنے زمانہ کے لحاظ سے بلند پایہ کا تھا۔ لیکن اس میں درجہ بندی کی قیود موجود تھیں۔ گو ستویقی حکماء انسانی اخوت کا دم بھرتے تھے۔ تاہم وہ اس تصور کو نباہ نہ سکے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ناصرت کے نبی نے اخوت ومساوات کا سبق کل دنیا کو سکھایا۔ آپ نے انسانی محبت کو کسی خاص دائرہ یا قبیلہ یا ملت یا قوم تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ حکم دیا کہ ہر شخص دوسرے کو بلا امتیاز قوم اور نسل اوررنگ پیار کرے ۔ حتیٰ کہ آپ نے فرمایا کہ جانی دشمنوں سے محبت رکھو تاکہ تم اپنے باپ کے جوآسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو۔ کیونکہ وہ اپنے سورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے اور راستبازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہ برساتا ہے ۔ کیونکہ اگر تم اپنے محبت رکھنے والوں سے ہی محبت رکھو تو تمہارے لئے کیا اجر ہے۔ اور اگر تم فقط اپنے بھائیوں ہی کو سلام کرو تو کیا زیادہ کرتے ہو۔ پس چاہیے کہ تم کامل ہوجیسا تمہاراآسمانی باپ کامل ہے (متی ۵: ۴۵تا ۴۸)۔ تمہاری محبت ہمہ گیر ہو۔

اس عالمگیر محبت سے کوئی شخص مستثنےٰ نہیں کیا گیا۔ تاریخ اس امر کی گواہ ہے ۔ کہ کلمۃ اللہ کی تعلیم نے ہر طرح کی تفریق اوردرجہ بندی کومٹادیا۔ ارسطو جیسا عظیم الشان فلاسفر غلامی کی قبیح رسم کو نہ صرف جائز بلکہ ایک قدرتی شے خیال کرتا تھا ۔ منجئی عالمین کی تعلیم نے غلامی کو بھی مٹادیا۔ غلام اور آزاد، غریب اور دولت مند، اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز دنیا سے اٹھ گیا۔ آپ ایک دفعہ ایک شخص کے گھر کھانا کھانے گئے۔ توآپ نے فرمایا ۔ کہ جب تم دوپہر کا یارات کا

کھانا پکواؤ تو اپنے دوستوں یا بھائیوں یا رشتہ داروں یا امیر امیر پڑوسیوں کو نہ بلانا کیونکہ وہ بھی تمہیں بلا کر تمہارا احسان چکا سکتے ہیں ۔ بلکہ جب تم ضیافت کرو تو غریبوں، ٹنڈوں، لنگڑوں اور اندھوں کو بلاؤ۔ اور تم برکت پاؤ گے۔ کیونکہ ان کے پاس کچھ نہیں جس سے وہ تمہارا احسان چکا سکیں ۔ تمہیں اس احسان کا بدلہ متقی اور پرہیزگاروں کی قیامت کے دن ملے گا۔(لوقا ۱۴ : ۱۲ تا ۱۴)۔

کلمۃ نے امیری اور غریبی کی درجہ بندی مٹانے کو ایک تمثیل کہی اور فرمایا " ایک آدمی بڑا امیر تھا۔ وہ ارغوانی قبا پہنتا تھا اور نفیس قسم کے سوتی کپڑے استعمال کرتا تھا اور ہر روز عیش و عشرت میں مگن رہتا تھا۔ ایک غریب آدمی جس کا نام لعزر تھا اس کے دروازہ پر پڑا رہتا تھا۔ اس کا تمام جسم پھوڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ امیر آدمی کی میز سے گرے ہوئے ٹکڑوں سے اپنا پیٹ بھر لے لیکن وہاں کتے آجاتے تھے اور اسکے پھوڑے تک چاٹنے لگتے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ بے چارہ غریب آدمی مر گیا۔ فرشتے اسے اٹھا کر لے گئے اور ابراہیم کی گود میں چھوڑ آئے۔ وہ امیر آدمی بھی فوت ہوا اور دفنایا گیا۔ جب اس نے عالم ارواح میں عذاب میں مبتلا ہو کر اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں تو دور سے ابراہیم کو دیکھا اور یہ بھی کہ لعزر ابراہیم کی گود میں ہے ۔ اس نے چلا کر کہا : اے باپ ابراہیم مجھ پر رحم کریں اور لعزر کو بھیج دیں تا کہ وہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے تر کر کے میری زبان کو ٹھنڈک پہنچائے کیونکہ میں اس آگ میں تڑپ رہا ہوں۔ لیکن ابراہیم نے کہا : بیٹا یاد کرو کہ تم اپنی زندگی میں اچھی چیزیں حاصل کر چکے اور اسی طرح لعزر بری چیزیں۔ لیکن اب وہ یہاں آرام سے ہے اور تم تکلیف میں ہو۔(لوقا ۱۶ : ۱۹ تا ۲۵)۔

کلمۃ اللہ اُن اشخاص کو جو زر سے محبت رکھتے تھے۔ ہمیشہ ملامت کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ " کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبت یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خدا تعالیٰ اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے ۔"(متی ۶ : ۲۴)۔ کلمۃ اللہ نے ایک طامع نوجوان کو فرمایا " خبردار ، ہر طرح کے لالچ سے دور رہو، کسی کی زندگی کا انحصار اس کے مال و دولت کی کثرت پر نہیں ہے۔(لوقا ۱۲ : ۱۵) ہماری زندگی کی مبارک حالی دولت و سیم و زر پر نہیں۔ بلکہ صرف ہماری روحانی قوت اور استعداد پر ہی موقوف ہے۔ آپ نے ایک تمثیل کے ذریعہ دولت کی بے مائیگی کو لوگوں پر واضح کیا اور فرمایا "کسی دولتمند کی زمین میں بڑی فصل ہوئی اور وہ دل ہی میں سوچ کر کہنے لگا : میں کیا کروں ؟ میرے پاس جگہ نہیں ہے جہاں میں اپنی پیداوار جمع کر سکوں تب اس نے کہا : میں ایک کام کروں گا کہ اپنے کھتے ڈھا کر نئے اور بڑے کھتے بناؤں گا اور ان میں اپنا تمام اناج اور مال و اسباب بھر دوں گا ۔ پھر اپنی جان سے کہوں گا : اے جان ! تیرے پاس کئی برسوں کے لئے مال جمع ہے ۔ آرام سے رہ ، کھا پی اور عیش کر۔ مگر پروردگار نے اس سے کہا : اے نادان ! اسی رات تیری جان تجھ سے طلب کر لی جائے گی ۔ پس جو کچھ تو نے جمع کیا ہے

وہ کس کے کام آئے گا؟ چنانچہ جو اپنے لئے توخزانہ جمع کرتا ہے لیکن رب العالمین کی نظر میں دولت مند نہیں بنتا اس کا بھی یہی حال ہوگا۔(لوقا ۱۲ : ۱۶ تا ۲۱)۔دنیا کی نظر میں وہ اشخاص جن کے پاس دولت ہے اور آسودہ مرفع حال اور ہر دلعزیز ہیں مبارک شمار کئے جاتے ہیں ۔ مفلس ، غریب اور غمزدہ لوگ بدقسمت سمجھے جاتے ہیں لیکن کلمتہ اللہ نے مفلس، تنگدست اور مصیبت زدہ لوگوں کومخاطب کرکے فرمایا " مبارک ہو تم جو ابھی بھوکے ہو کیونکہ تم آسودہ ہوگے۔مبارک ہو تم جب ابن آدم کے سبب سے لوگ تم سے کینہ رکھیں اور تمہیں الگ کردیں، تمہاری بے عزتی کریں اور تمہارے نام کو براجان کر کاٹ دیں۔ اس دن خوش ہونا اور شادمانی کرنا کیونکہ آسمان پر بڑا اجر حاصل ہوگا اس لئے کہ ان کے آباوجداد نے نبیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا تھامگر افسوس تم پر جو دولتمند ہو کیونکہ تم اپنی تسلی پا چکے ہو۔افسوس تم پر جواب سیر ہو کیونکہ تم بھوک کا شکار ہوگے۔ افسوس تم پر جواب ہنستے ہو کیونکہ تم ماتم کروگے اور روؤ گے۔(لوقا ٦: ۲۱تا ۲۵)۔

ایک دفعہ ایک شخص کلمتہ اللہ کے پاس آیا۔ اور پوچھا کہ " میں کیا کروں کہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں آپ کی مردم شناس نگاہ نے تاڑ لیا کہ وہ دولت کا عاشق ہے ۔ فرمایا " ایک بات کی تجھ میں کمی ہے ۔جوکچھ تیرا ہے بیچ کر غریبوں کو دے دے ۔ تجھے آسمان پر خزانہ ملیگا۔ اورآکر میرے پیچھے ہولے"(مرقس ۱۰ : ۲۱)" وہ جوان یہ جواب سن کر غمگین ہوکے چلا گیا۔ کیونکہ بڑامالدار تھا"(متی ۱۹ : ۲۲) اس پر سیدنا مسیح نے حواریوں کو مخاطب کرکے فرمایا " بچوں ! جو لوگ دولت پر بھروسہ رکھتے ہیں ان کے لئے خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا کیا ہی مشکل ہے۔ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو"۔ (مرقس ۱۰ : ۲۴تا ۲۵)۔ کلمتہ اللہ کی نگاہ میں طمع گناہ کبیرہ سے کسی صورت میں بھی کم نہ تھا۔چنانچہ آپ کا ایک رسول بھی کہتا ہے کہ " لالچ بت پرستی کے برابر ہے" (کلسیوں ۳: ۵) آپ کی تعلیم کے مطابق دولت قبضے میں رکھنے کی شے نہیں ہے وہ ایک امانت ہے جس پر خدا نے ہم کو مختار کیا ہے(۱۲ : ۴۲تا ۴۷۔ ۱۹ : ۱۱تا ۲۷)۔ لیکن دنیا کے دولتمند اس حقیقت کو ناپسند کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ مالدار کلمتہ اللہ اورآپ کے حواریوں اور پیروؤں کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔(لوقا ۱٦ : ۱۴) جب آپ نے دیکھا کہ زردوست آپ کو ٹھٹھوں میں اڑاتے ہیں ۔ توآپ نے فرمایا کہ " جو چیز آدمیوں کی نظر میں عالی قدر ہے وہ خدا کے نزدیک مکروہ ہے "(لوقا ۱٦ : ۱۵) دنیا کی نگاہ میں دولت اور حشمت عالی قدر باتیں ہیں۔ لیکن " وہ خدا کے نزدیک مکروہ ہیں"۔

کلمتہ اللہ نے مفلس زدہ لوگوں کا افلاس دور کرنے کی خاطر کوئی لمبا چوڑا لائحہ عمل مرتب نہیں کیا۔ بلکہ محبت کے اصول کو اعلیٰ ترین نصب العین قرار دے کر ہر قسم کے لائحہ عمل کو اس کے ماتحت کردیا۔ اگرہم اپنے ابنائے جنس سے محبت کرینگے تو افلاس وغربت کا خود بخود قلع قمع ہوجائیگا مذکورہ بالا واقعہ

عبرانیوں کی انجیل میں یوں مرقوم ہے"ایک دولتمند نے سیدنا مسیح کو کہا۔اے آقا! میں کیا کروں کہ زندگی حاصل کروں۔ آپ نے اسے جواب دیا۔ میاں شریعت اور صحائف انبیاء پر عمل کر۔ اس نے کہا کہ ان سب پر میں نے عمل کیاہے۔ سیدنا مسیح نے جواب دیا۔ جو کچھ تیرا ہے بیچ کر غریبوں کو دے۔ اور آکر میرے پیچھے ہولے اس پر دولتمند اپنا سر کھجلانے لگا۔ کیونکہ یہ بات اس کو پسند نہ آئی ۔ سیدنا مسیح نے اس کو کہا کہ تو کس طرح کہہ سکتا کہ میں نے شریعت اور صحائف انبیاء پر عمل کیا ہے۔ درحالیکہ شریعت میں لکھاہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ ۔ دیکھ تیرے بہت سے بھائی جو آلِ ابراہیم ہیں چیتھڑوں میں زندگی بسر کررہے ہیں۔ اور بھوکوں مررہے ہیں مگر تیرا گھر مال، اسباب اور سامانِ خوردونوش سے بھرا پڑاہے ۔ اور اس میں سے کچھ نہیں نکلتا[57]۔

پس ابن اللہ کی تعلیم کا خصوصی اور امتیازی نشان خدا کی ابوت ومحبت اورانسانی اخوت ومساوات ہے۔ یہ اصول ایسے ہیں جو دیگر ادیانِ عالم میں نہیں ملتے ۔ بالخصوص قرآن میں بنی نوع انسان سے محبت رکھنے کے خلاف جہاد کی تعلیم موجود ہے ۔ قرآن کہتا ہے کہ " تم (اے مسلمانوں) کفار کو یہاں تک قتل کرو کہ فتنہ (یاغلبہ کفر) نہ رہے اور تمام دین خدا کا ہوجائے۔ جنگ کفار کے لئے جس قدر تم سے ہوسکے قوت اور گھوڑے باندھنے کی تیاری کرو۔ تاکہ ایسا کرنے سے تماپنے اور خدا کے دشمنوں کوڈراؤ۔ اے نبی مسلمانوں کو لڑائی پر ابھار"(سورہ انفال ترجمہ فیض بخش ایجنسی) " اے نبی کافروں اورمنافقوں سے جہاد کر ۔ اوران پر سختی کہ" (سورہ تحریم)" مشرکوں کوجہاں پاؤ۔ قتل کرو اور پکڑواور گھیرواور ہرگھات کی جگہ میں ان کے لئے بیٹھو۔ پھر اگروہ توبہ کریں (یعنی مسلمان ہوں) اور نماز پڑھیں اورزکواۃ دیں تو تم ان کو جانے دو"(سورہ توبہ) ان آیات نے آیت الاکرافی دین (دین کےمعاملہ میں کوئی جبر نہیں) کو منسوخ کردیا۔

ایسی تعلیم کے خلاف کلمۃ اللہ تمام عمر جہاد کرتے رہے۔آپ نے الہیٰ ابوت کی تعلیم دے کر اخوت انسانی کا سبق تمام دنیا کو سکھادیا۔ اس دنیامیں جودرجہ بندی اور دیگر اختلافات سے پُرہے اخوت ومساوات کو قائم کرنے اوران کو ترقی دینے کا سہرہ صرف مسیحی تعلیم کے سرپر ہی رہاہے۔ چنانچہ مورخ لیکی کہتاہے " مسیحیت نے انسانی فرائض اورانسانی تعلقات میں ایک نئی روح پھونک دی۔ حرُیت اورمساوات کی سرورانگیز صداؤں نے فضائے عالم میں ایک دلپذیر تبدیلی پیدا کردی اس نے انسانی اخوت اورمساوات کا ایک نیا تخیل پیش کیا جس نے ذات پات اور درجہ بندی کی تعریف کومٹادیا[58]۔

پس کلمۃ اللہ کی تعلیم دنیا کے لئے امن وعافیت محبت ورحمت اُخوت ومساوات ، حرُیت وانصاف کا پیغام بن کرآئی ہے۔

[57] M.R.James.The Apocrypal New Testament. P.6

[58] Lecky.Op.Cit.Vol.2.p.47.

(۲)

خیرات:

انسانی اُخوت کا عملی پہلو خیرات اور سخاوت ہے۔ کلمتہ اللہ نے محبت کی تعلیم پر زور دے کر امیرو غریب کے فرق کا ڈنگ نکال دیا۔ اہلِ یونان کے نزدیک غریب، مفلس، بیمار اور مصیبت زدہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ حکیم سقراط نے کبھی کسی سے غربت وافلاس کی نسبت سوال نہ کیا افلاطون کی نظر میں تمام بیمار اور کمزور اور عمر رسیدہ اشخاص قابل نفرت تھے جن کا زندہ رہنا ملک کے حق میں مفید[59] نہ تھا۔ ارسطو اپنی کتاب میں جہاں نیکیوں کی فہرست دیتاہے وہاں رحم، سخاوت یا خیرات کا ذکر تک نہیں کرتا۔

کلمتہ اللہ اس دنیا میں پہلے معلم تھے جنہوں نے اخوت انسانی کے اس عملی پہلو پر اس قدر زور دیا کہ آپ نے اس کے بغیر خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا غیر ممکن قرار دے دیا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ عدالت کے روز جب سب اقوام عالم کا حساب لیا جائیگا تو خدا کی بادشاہت کا " اس وقت بادشاہ اپنے دہنی طرف والوں سے کہے گا آؤ میرے پروردگار کے مبارک لوگو جو بادشاہی بنائی عالم سے تمہارے لئے تیار کی گئی ہے اسے میراث میں لے لو۔ کیونکہ میں بھوکا تھا، تم نے مجھے کھانا کھلایا، میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی پلایا، میں پردیسی تھا، تم نے مجھے اپنے گھر میں اتارا۔ ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا پہنایا، بیمار تھا تم نے میری خبر لی، قیدمیں تھا، تم میرے پاس آئے، تب دیانتدار جواب میں اس سے کہیں اے مولا ہم نے کب آپ کو بھوکا دیکھ کر کھانا کھلایا، پیاسا دیکھ کر پانی پلایا؟ ہم نے کب آپ کو پردیسی دیکھ کر گھر میں اتارا؟ یا ننگا دیکھ کر کپڑا پہنایا؟ ہم کب آپ کو بیمار دیکھ کر آپ کے پاس آئے؟ بادشاہ جواب میں ان سے فرمائے گا میں تم سے سچ کہتا ہوں جب تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی کےساتھ یہ سلوک کیا تو میرے ہی ساتھ کیا۔ پھر وہ بائیں طرف والوں سے کہے گا اے ملعونو میرے سامنے سے اس ہمیشہ کی آگ میں چلے جاؤ جو ابلیس اور اس کے فرشتوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ کیونکہ میں بھوکا تھا، تم نے مجھے کھانا نہ کھلایا، پیاسا تھا، تم نے مجھے پانی نہ پلایا۔ پردیسی تھا تم نے مجھے گھر میں نہ اتارا، ننگا تھا، تم نے مجھے کپڑا نہ پہنایا، بیمار اور قید میں تھا، تم نے میری خبر نہ لی، تب وہ بھی جواب میں کہیں گے اے مولا! ہم نے کب آپ کو بھوکا یا پیاسا یا پردیسی یا ننگا یا بیمار یا قید میں دیکھ کر آپ کی خدمت نہ کی؟ اس وقت وہ ان سے فرمائے گا یہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تم نے ان سب سے چھوٹوں میں سے کسی کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا تو میرے ساتھ نہ کیا؟ اور یہ ہمیشہ کی سزا پائیں گے مگر دیانتدار ہمیشہ کی زندگی۔(متی ۲۵: ۳۴تا ۴۶)۔

دنیائے مذہب میں یہ ایک نیا اصول تھا جو کلمتہ اللہ نے فرمایا کہ "چونکہ تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی ایک کے

[59] Plato Repbulic.

ساتھ یہ کیا اس لئے میرے ہی ساتھ کیا" ۔ کسی جماعت کی کامیابی کا راز اس کی مشاہیر پرستی پر مضمر ہے۔ ان الفاظ سے وہ جوشِ عقیدت ومحبت عیاں ہے۔ جو شاگرد کلمتہ اللہ کے لئے رکھتے تھے ۔ یہ اس جذبہ کو ظاہر کرتے ہیں جو استاد اور شاگرد ، آقا اور خادم ، ابن اللہ اور آپ کے پیروؤں میں تھا فلاسفہ کے فلسفہ میں محرکات کا فقدان تھا۔ کلمتہ اللہ نے بہترین محرکات اور مرغبات مہیا کردیئے۔ آپ نے فرمایا " تم کو فلاں کام مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن میری خاطر اس کو کرو۔ ایثار نفسی تم کو بھلی معلوم نہیں ہوتی ۔ لیکن اگر اس کو میری خاطر کروگے تو انبار معلوم نہ ہوگی۔ غریبوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت کرنا تم کو آسان معلوم نہیں دیتا ۔ لیکن اگر میری خاطر تم مصیبت زدوں اور غریبوں کی امداد کروگے تو تم کو خوشی حاصل ہوگی۔ مورخ لیکی کہتا ہے کہ " درحقیقت مسیحی اخلاق کے چشمہ کا منبع مسیح کی محبت رہی ہے ۔ پس جو لوگ ایک مرتبہ مسیح کے عشق ومحبت میں سرشار ہوجاتے ہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں انتہائی خلوص وذوق سے کرتے ہیں جس میں نہ خوف کی آمیزش ہوتی ہے اور نہ صلہ تحسین کی [60] کی۔ "یہودی فاضل ڈاکٹر مانٹی فیوری بھی کہتا ہے کہ " یہ ایک نئی ترغیب تھی ۔ جس نے دنیا کی تاریخ پر بے حد اثر کیا ہے۔سیدنا مسیح نے بے اختیار جذبہ کی ایک ایسی چنگاری جلادی جس نے اس کی وفات کے بعد جذبات کو ایسا مشتعل کردیا۔ کہ اس کی حین حیات میں کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ الفاظ " سیدنا مسیح

[60] Lecky .Op.Cit.Vol.2.p.5

کی خاطر" نے ہزاروں اشخاص کی زندگیوں کو نیکی کی جانب راغب کردیا ۔ اور ہزاروں شہیدوں کی موت کے وقت یہی الفاظ ان کے حرزِ جان [61] رہے ہیں"۔ درحقیقت یہ الفاظ صفحہ گیتی پر خون کے حروف میں لکھے ہوئے موجود ہیں۔ اور آج بھی مسیحی جماعت کے افراد لاکھ گئے گذرے، بودے ہوں، پست ہمت ہوں لیکن اپنے آقا ومولا کے نام پر اوراس ذاتِ قدسی صفات کی خاطر مفلسوں ناداروں، فلاکت زدوں، مصیبت کے ماروں پر اپنی دولت ہی نہیں بلکہ نقدجان تک لٹادینے کے لئے تیار ہیں۔مورخ لیکی کہتا ہے ۔ کہ دنیا میں سب سے اول بار مسیحیت نے یہ بتایا کہ سخاوت انسان کے فرائض اخلاق میں داخل ہے اور تمام معلمین مسیحیت اس تعلیم کو زور کے ساتھ پیش کرتے رہے۔اس سے بھی زیادہ پر اثر طریقہ مسیحیت نے یہ اختیار کیا۔ کہ خود مسیح کو فقر ومسکنت کا مجسمہ قرار دے دیا۔ اور اس لئے جو لوگ فقراء اور مساکین کی امداد کرتے تھے وہ گویا خود مسیح کی خدمت کرتے تھے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سخاوت وفیاضی مسیحیت کا جزو غیر منفک بن گئی جس سے مسیحی کسی وقت اور کسی حال میں بھی فاعل نہیں ہوتے تھے [62] "۔

یہودی ربی اپنی صحف مقدسہ کے احکام کے بموجب (یسعیاہ ۵۸: ۷ وغیرہ) خیرات تو کرتے تھے ۔ لیکن وہ خیرات کے صحیح مفہوم سے ناواقف

[61] Montefiore , Religious Teachings of Jesus p.133.
[62] Lecky Op.Cit.Vol.2pp.51-56

تھے۔ نہ کے انبیاء نے محرکات ومرغبات کی تعلیم دی تھی جو کلمۃ اللہ نے مہیاکئے۔ علاوہ ازیں وہ محض لوگوں کو دکھلانے کی خاطر سخاوت کرتے تھے۔ تاکہ لوگ ان کی بڑائی کریں۔ اوران کی تعریف میں قصیدے پڑھیں۔لیکن کلمۃ اللہ نے فرمایا" پس جب تم خیرات کرو تو اپنے آگے نرسنگا نہ بجوا جیسا منافق عبادت خانوں اور کوچوں میں کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کی بڑائی کریں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پاچکے۔ بلکہ جب تم خیرات کرو توجو تمہارا دہنا ہاتھ کرتا ہے اسے تمہارا بایاں ہاتھ نہ جانے ۔ تاکہ تمہاری خیرات پوشیدہ رہے ۔ اس صورت میں تمہارا پروردگار جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تمہیں اجر دے گا۔(متی ۶ : ۲تا ۴)۔ خیرات کا تعلق دلی جذبات کے ساتھ ہے۔ پس لازم ہے کہ ہم ازراہِ رحم وترس ومحبت ، خیرات اور سخاوت کریں نہ کہ خود بینی ، خود نمائی اور خودستائی کی خاطر لوگوں کی مدد کریں خدا ہمارے خیالات اور جذبات کو دیکھتا ہے ۔ وہ ہمارے "دلوں اور گردوں" کا جانچنے والا ہے۔ اورہمارے اصلی اور حقیقی مقاصد واغراض سے آگاہ ہے ۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ کتنے آدمیوں کے واسطے سخاوت کی گئی ہے۔ یا کتنی رقم دے گئی ہے مگر اس کی نگاہ ہمارے دل کے جذبات پر لگی ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کلمۃ اللہ بیت اللہ کے خزانے کے سامنے تشریف رکھتے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ " لوگ بیت اللہ کے خزانہ میں چندہ کس طرح ڈالتے ہیں اور بہتیرے دولت مند بہت کچھ ڈال رہے تھے۔اتنے میں ایک کنگال بیوہ نے آکر دو دمڑیاں یعنی ایک دھیلا ڈالا۔آپ نے اپنے صحابہ کرام کو پاس بلا کر ان سے فرمایامیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو بیت اللہ کے خزانہ میں ڈال رہے ہیں اس کنگال بیوہ نے ان سب سے زیادہ ڈالا ۔ کیونکہ سبھوں نے اپنے مال کی بہتات سے ڈالامگر اس نے اپنی ناداری کی حالت میں جو کچھ اس کا تھا یعنی اپنی ساری روزی ڈال دی ۔(مرقس ۱۲ : ۱۴تا ۴۳)۔حالانکہ اس بیوہ نے صرف ایک پائی دی تھی جو دنیا کی نظر میں کچھ قدر نہیں رکھتی ۔ یہودی ربیوں کا حکم تھا کہ کوئی شخص ایسی چھوٹی رقم خیرات نہ کیا کرے[63]۔ لیکن سیدنا مسیح کی نظر میں وہ بڑی سے بڑی رقم سے بھی زیادہ گرانقدر تھی۔ خدا اس بات کو نہیں دیکھتا کہ کون سخاوت کرتا ہے یا کیا دیتا ہے۔ یا کتنی رقم دیتا ہے بلکہ اس بات کو دیکھتا ہے کہ کس جذبہ اور مقصد سے خیرات کی گئی ہے اور کتنی ایثار نفسی سے کام لیا گیا ہے۔

(۳)

محصول لینے والے اور گنہگار:

اہل یہود میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن سے فریسیوں نے ترکِ موالات اختیار کررکھی تھی۔ اورجن کو وہ بنظرِ حقارت دیکھتے تھے یہ جماعت "محصول لینے والے گنہگاروں" کی تھی۔ ہیرودیس اور رومیوں کے زمانہ حکومت میں اہل یہود محصول کے بوجھ کے مارے چیخ پکار کرتے رہتے

[63] St.Mark (Century Bible Revised ed).p.345

تھے۔ کیونکہ حکمران محصول کی چوکیاں ٹھیکے پر دے دیتے تھے اور ٹھیکہ دار جو محصول چاہتے تھے لوگوں سے وصول کرلیتے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام محصول لینے والے نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اوران کے ہم وطن ان کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتے تھے۔

"محصول لینے والوں" کی جماعت کے علاوہ ایک اورجماعت تھی جس سے فریسی دامن کش رہتے تھے یہ بھی محصول لینے والوں کی طرح" اچھوت ذات" خیال کی جاتی تھی[64]۔ یہ جماعت "گنہگاروں" کی جماعت کہلاتی تھی اوراس میں وہ تمام لوگ شریک تھے جن کو ان نام نہاد راستبازفریسیوں نے کبیرہ گناہوں ک ارتکاب کرنے کی وجہ سے اپنی قوم اور برادری سے خارج کر رکھا تھا۔ فریسیوں کا حجاج ان کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ اپنے کھلیان کو خوب صاحب کیا کرتے تھے لیکن جس شے وہ بھوسی سمجھتے تھے وہ کلمتہ اللہ کی نظر میں گرانقدر تھی اور جس کو وہ گیہوں خیال کرتے تھے وہ آپ کی مردم شناس نظر میں بھوسی سے بھی کم مایہ تھی۔ فریسی ان اشخاص کو جو علانیہ گناہوں کا ارتکاب نہیں کرتے نہیں کرتے تھے اور قوم کے" معزز" رکن خیال کئے جاتے تھے ۔ ان کے گناہوں کی وجہ سے ملامت تک نہیں کرتے تھے۔ لیکن کلمتہ اللہ نے علانیہ اور خفیہ گناہوں کی تمیز کو مٹادیا۔ آپ نے ان پراس ہمالیہ سے بھی بڑی غلطی کو ظاہر فرمایا اور یہ تعلیم دی کہ دولت کی محبت خود غرضی ، خودپرستی ، خودنمائی ، غرور تمکنت اور عیب جوئی جیسے " معزز" گناہ خدا کی نظر میں بت پرستی ، زنا اور قتل وغیرہ کے برابر ہیں۔ بلکہ آپ کے خیال میں مقدم الذکر گناہ "کبیرہ" گناہوں سے بھی زیادہ سنگین تھے کیونکہ ان کے ارتکاب کرنے والوں کو احساس گناہ نہ تھا۔ لہذاوہ ان سے توبہ بھی نہیں کرتے تھے۔ اسی واسطے آپ نے فرمایا کہ "محصول لینے والے اور کسبیاں" (جو کبیرہ گناہوں کی مرتکب ہوکر توبہ کرتی ہیں) فریسیوں اور کاہنوں کی جماعت سے (جن کو اپنے گناہوں کا احساس بوجہ ضمیر کی مُردگی کے نہیں رہا)" پہلے خدا کی بادشاہت میں داخل ہونگی(متی ۲۱: ۳۱)۔

دوڑا زاہد کہ قیامت میں قیامت آئی
داخلِ خلد گنہگار ہوئے جاتے ہیں

فریسی ایک دوسرے کو " معزز" خیال کرتے تھے لیکن "وہ عزت " جو خدائے واحد سے ہوتی ہے یا نہیں چاہتے تھے"(یوحنا ۵: ۴۴)۔

فریسیوں کا یہ خیال تھا کہ خدا محاسب ہے جواحکام صادر کرنے کے بعد نیک وبد اعمال کے حساب میں مشغول رہتاہے۔ پس شرعی احکام کی ظاہری تابعداری اور نیکی دونوں مترادف باتیں سمجھی جاتی تھیں۔ لہذا " جو شخص شریعت کو جانتا اوراس پر عمل کرتاہے وہ نیک ہے اور جو شریعت سے

[64] Disinherited Masses" Expression used by Bacon in his Beginning of Gospel Story.(1909).

ناواقف ہے اوراس پر عمل نہیں کرتا بدکار[65] ہے"۔ پس فریسیوں نے نیکی اوراخلاق کو صرف ظاہری افعال تک محدود کررکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ وہ الہیٰ حکام کو نہیں توڑتے لہذا وہ راستباز ہیں۔ پس وہ اس راستبازی پرنازاں رہتے اور" ناراستوں" کو بنظرِ حقارت دیکھتے تھے ۔کلمتہ اللہ نے ایسی تعلیم کے خلاف اپنے حواریوں کو خبردار کیا اور فرمایا" میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تمہاری راستبازی فقیہوں اور فریسیوں کی راستبازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہت میں ہر گز داخل نہ ہوگے "(متی ۵: ۲۰) آپ نے یہ تعلیم دی کہ راستبازی مختلف احکام کی تعمیل کا نام نہیں ہے ۔ اور نہ گناہ فلاں فلاں حکم توڑنے کا نام ہے بلکہ انسان کسی خاص حکم کو توڑے بغیر بھی گنہگار ہوسکتاہے کیونکہ راستبازی ظاہری افعال پر ہی مشتمل نہیں بلکہ انسان کی باطنی حالت پر موقوف ہے آپ نے ایک تمثیل کے ذریعہ اس حقیقت کو واضح کیا ۔ اور فرمایا کہ" دو آدمی دعا کرنے کے لئے بیت اللہ میں گئے۔ دینی عالم تھا اور دوسرا ٹیکس لینے والا ۔ دینی عالم نے کھڑے ہو کر دل ہی دل میں یوں دعا کی: اے پروردگارِ عالم میں آپ کا شکر کرتا ہوں کہ میں دوسرے آدمیوں کی طرح نہیں ہوں جو لٹیرے ،ظالم اور زناکار ہیں اور اس ٹیکس لینے والی کی مانند بھی نہیں ہوں۔ میں ہفتہ میں دو بار روزہ رکھتا ہوں اور اپنی ساری آمدنی پر عشر ادا کرتا ہوں ۔ لیکن اس ٹیکس لینے والے نے جو دور کھڑا ہوا تھا اتنا بھی نہ چاہا کہ آسمان کی طرف نظر

[65] Montefiore , Hibbert Lectures p.479.

اٹھائے بلکہ چھاتی پیٹ پیٹ کرکہا: پروردگار مجھ گنہگار پر رحم کریں۔ میں تم سے کہتا ہوں یہ آدمی اس دوسرے سے خدا کی نظر میں زیادہ مقبول ہو کر اپنے گھر گیا(لوقا ۱۸: ۱۰تا ۱۴)۔فریسی اپنے اعمال پر نازاں تھا اور ظاہری افعال کی وجہ سے اپنے آپ کو راستباز خیال کرتا تھا۔ لیکن " اس کا دل اس میں راست نہیں " تھا ۔ (حبقوق ۲: ۴)۔ لیکن محصول لینے والا بارگاہِ ایزدی سے اپنے گناہوں کی مغفرت حاصل کرکے راستباز ٹھہرا۔

نصیب ماست بہشت اے خداشناس برد
کہ مستحق کرامت گنہگار اینند

بعض یہودی مصنفین لکھتےہیں کہ فریسی کئی قسم کے تھے:

(۱۔) وہ جو اپنے کندھوں پر اپنے نیک اعمال کی فہرست لٹکا کر باہر جایا کرتے تھے۔

(۲۔) وہ جو کہتے تھے کہ ہماری نیکیاں ہمارے گناہوں سے شمار میں بہت زیادہ ہیں۔

(۳۔) وہ جو کہتے تھے کہ کاش ہم جانتے کہ ہم نے کوئی گناہ کیا ہے تاکہ اپنے نیک اعمال سے اس کے داغ کو مٹا ڈالتے !چنانچہ یہودی عالم فریڈ لینڈر سیدنا مسیح کے ہم عصر یہود کی نسبت فتویٰ دیتا ہے کہ" نہ صرف صدوقی بلکہ فریسی بھی کامل طور پر دنیا دار بن گئے تھے اور بدترین مادیت اور ریاکاری کی زندگی بسر کرتے تھے ۔۔۔۔۔ اس صدی کے بدترین کیڑے کا نام"فریسی"

تھا وہ دنیا کو تباہ کرنے والے تھے[66] ۔ جس جماعت کے شرکاء کی ذہنیت اس درجہ تک گرچکی ہو اس سے کس طرح توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ گنہگاروں کو ترس اور محبت کی نگاہ سے دیکھیگا؟ فریسی اپنے ظاہری افعال کے سبب اپنے آپ کو راستباز اور "محصول لینے والوں اور گنہگاروں" کو ملعون اور جہنم کےوارث خیال کرتے تھے۔ لیکن کلمۃ اللہ ان گنہگاروں اور محصول لینے والوں کے پاس جاتے ان کو خدا کی محبت و ابوت کا پیغام سناتے اور ان کے ساتھ اختلاط اور محبت کا رابطہ قائم کرتے تھے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ " سارے محصول لینے والے اور گنہگار اس کے پاس آتے تھے تاکہ اس کی باتیں سنیں"(لوقا ۱۵ : ۱)فریسی یہ دیکھ کر بڑبڑاتے تھے(لوقا ۵: ۳۰) کلمۃ اللہ کے خلاف ان کو ہمیشہ یہی شکایت رہی اور وہ آنخداوند کو طعنہ دے کرکہتے تھے یہ شخص " محصول لینے والوں اور گنہگاروں کا یار ہے"(متی ۱۱ : ۱۹)لیکن آپ کو اس بات کی پروا نہ تھی آپ اس خارج شدہ جماعت کے شرکاء کےساتھ آزادانہ ملتے۔ ان کےساتھ کھاتے پیتے ان کے گھروں میں جاتے اور ان کو اپنے گھر بلاتے تھے(لوقا ۱۹ : ۷، مرقس ۲: ۱۴، متی ۹: ۱۰تا ۱۳ وغیرہ)چنانچہ ایک دفعہ جب آپ کھانا کھارہے تھے تو بہت سے محصول لینے والے اور گنہگارآپ کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھے" تم محصول لینے والوں اور گنہگاروں کے ساتھ کیوں کھاتے پیتے ؟ آپ سیدنا نے جواب میں ان سے فرمایا :کہ بیماروں کو طبیب کی ضرورت ہوتی ہے تندرستوں کو نہیں میں متقی اور پرہیزگاروں کو نہیں بلکہ گنہگاروں کو توبہ کرنے کے لئے بلانے آیا ہوں۔(لوقا ۵: ۳۰تا ۳۲)۔

کلمۃ اللہ نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اس خارج شدہ جماعت میں سے ایک شاگر متی کو منتخب بھی کیا۔ جوہر وقت آپ کےساتھ رہتا تھا اس انتخاب سے یہودی ربیوں اور فریسیوں کو ضرور ٹھوکر لگی ہوگی اور بظاہر طور پر آپ کی منادی کو ضرور صدمہ پہنچا ہوگا۔ لیکن آپ نے اس بات کی رتی بھر پروانہ کی آپ نے فریسیوں کی حماقت آمیز روش کے خلاف احتجاج کیا۔ اوران پر یہ صداقت ظاہر فرمائی کہ بارگاہِ الہیٰ میں تائب گنہگار کی ایسے شخص سے زیادہ قدر ہے۔ جواپنے آپ کوراستباز خیال کرتاہے۔

گنہگار اندیشہ ناک از خدا

بہ از پارسائے عبادت نما

چنانچہ ایک دفعہ ابن اللہ کسی فریسی شمعون کے گھر کھانا کھارہے تھے ۔ ایک بدچلن عورت جو اسی شہر کی تھی یہ سن کر کہ آپ دینی علما کے گھر میں کھانا کھانے بیٹھےہیں سنگ مرمر کے عطر دان میں عطر لائی۔اس نے آپ کے پاؤں کے پاس پیچھے کھڑی ہو کر رونا شروع کردیا اور اپنے آنسوؤں سے آپ کے پاؤں بھگونے لگی اور اپنے سر کے بالوں سے انہیں پونچھ کر بار بار انہیں چومنے لگی اور عطر سے ان کا مسح کرنے لگی۔ جس دینی علما نے آپ کو دعوت دی تھی اس نے یہ دیکھا تو دل ہی دل میں کہنے لگا کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو جان لیتا کہ جو

[66] Encyclopedia Biblica Vol.4.p.4325

اسے چھورہی ہے وہ کون اور کیسی عورت ہے یعنی یہ کہ وہ بدچلن ہے۔"بعینہ یہ خیال آنجہانی مرزا صاحب قادیانی نے اپنے رسالہ ضمیمہ انجام آتھم میں صفحہ ۶ پردہرایا ہے۔ سیدنا مسیح نے جو جواب فریسی کو دیا وہ مرزا صاحب اوراس کے قادیانی مریدوں کے لئے کافی ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا "کسی ساہوکار کے دو قرضدار تھے۔ ایک نے پانچ سو دینار اور دوسرے نے پچاس دینار لئے ہوئے تھے۔ ان کے پاس قرض ادا کرنے کو کچھ بھی نہ تھا لہذا اس نے دونوں کا قرض معاف کردیا۔ ان میں سے کون زیادہ پیار کرے گا ؟ شمعون نے جواب دیا: میرے خیال میں وہ جسے اس نے زیادہ معاف کیا۔ سیدنا عیسیٰ مسیح نے اس سے فرمایا تم نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ تب آپ نے عورت کی طرف مڑ کر شمعون سے فرمایا: تم اس خاتون کو دیکھتے ہو؟ میں تمہارے گھر میں داخل ہوا تو تم نے میرے پاؤں دھونے کے لئے پانی نہ دیا لیکن اس خاتون نے اپنے آنسوؤں سے میرے پاؤں بھگودیئے اور اپنے بالوں سے انہیں پونچھا۔ تم نے مجھے بوسہ نہ دیا لیکن جب سے میں اندر آیا ہوں ۔ یہ خاتون میرے پاؤں چومنے سے باز نہیں آرہی ہے۔ تم نے میرے سر پر تیل نہ ڈالا لیکن اس خاتون نے میرے پاؤں پر عطر انڈیلا ہے اسی لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ اس کے گناہ جو بہت تھے بخش دیئے گئے ہیں چونکہ اس نے بہت محبت ظاہر کی لیکن جس کو تھوڑا معاف کیا گیا ہے وہ تھوڑی محبت دکھاتا ہے ۔ تب سیدنا عیسیٰ نے اس خاتون سے فرمایا: تمہارے گناہ معاف ہوئے ۔ جو لوگ آپ کے ساتھ دستر خوان پر تھے یہ سن کر دل ہی دل میں یہ کہنے لگے یہ کون ہے جو گناہ بھی معاف کرتا ہے ؟ لیکن آپ نے خاتون سے فرمایا : تمہارے ایمان نے تمہیں بچالیا ہے ، سلامتی کےساتھ رخصت ہو!(لوقا ۷: ۳۷تا ۵۰)۔

لنگرِ حلم تواے کشتی توفیق کجاست

کہ دریں بحر کرم غرق گناہ آمدہ ایم

کلمۃ اللہ نے اہل یہود کو فرمایا کہ" ننانوے راستبازوں کی نسبت جو توبہ کی حاجت نہیں رکھتے ایک توبہ کرنے والے گنہگار کی بابت آسمان پر زیادہ خوشی ہوتی ہے(لوقا ۱۵ : ۷)۔

ابن اللہ کا یہ معمول تھا کہ ایسے لوگوں سے جو "توبہ کی حاجت" رکھتے تھے ضرور رابطہ محبت پیدا کرتے تاکہ خدا کی ازلی محبت ان پر ظاہر کریں چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے آپ یریحو میں داخل ہو کرجارہے تھے اور" وہاں ایک آدمی تھا جس کا نام زکائی تھا۔وہ ٹیکس لینے والوں کا افسر اعلیٰ تھا اور کافی دولتمند تھا۔ وہ آپ کو دیکھنے کا خواہشمند تھا لیکن اس کا قد چھوٹا اس لئے وہ ہجوم میں سیدنا عیسیٰ کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ لہذا وہ دوڑ کرآگے چلا گیا اور ایک گولر کےدرخت پر چڑھ گیا تاکہ جب آپ اس جگہ سے گذرے تو وہ آپ کو دیکھ سکے۔سیدنا عیسیٰ اس جگہ پہنچے توآپ نے اوپر دیکھ کر اسے فرمایا: اے زکائی جلد سے نیچے اترآؤ کیونکہ آج میں تمہارے گھر میں مہمان بن کرآنے والا ہوں۔ پس وہ فوراً نیچے اترآیا اور آپ کو خوشی خوشی اپنے گھر لے گیا۔ یہ دیکھ کر سارے لوگ بڑ بڑانے لگے کہ یہ ایک

گنہگار کے مہمان جابنے ہیں۔ زکائی نے کھڑے ہو کر سیدنا عیسیٰ سے کہا: میں اپنا آدھا مال غریبوں کو دیتا ہوں اور اگر میں نے دھوکے سے کسی کا کچھ لیا ہے تو اس کا چوگنا واپس کرتا ہوں۔ آپ نے اس سے فرمایا: آج اس گھر میں نجات آئی ہے کیونکہ یہ بھی آل ابراہیم میں سے ہے ۔ ابن آدم گمشدہ کو ڈھونڈنے اور بچانے آیا ہے ۔(لوقا ۱۹: ۱تا ۱۰)۔

ابن اللہ کی خدمت کا نصب العین یہی تھا کہ دنیا کے گم گشتہ فرزندوں کو پھر آسمانی باپ کے پاس لائیں تاکہ خدا کا محبت بھرا ارادہ جو وہ کل بنی نوع انسان کے لئے رکھتا ہے ان پر ظاہر کرے(متی ۱۱: ۲۵) خدا نہ صرف راستبازوں کا باپ ہے جو اس کے احکام بجالاتے ہیں بلکہ اس کی محبت گنہگاروں اور بدکرداروں پر بھی حاوی ہے اور وہ سب کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔

بے منت و بے سوال و بے استحقاق
دیتا ہے جو سب کو یا الہیٰ تو ہے

کلمتہ اللہ نے کسی شخص کو اس کی گذشتہ بُری زندگی کی وجہ سے خدا کی بادشاہت سے خارج نہ کیا اس بادشاہت کے دروازے جس طرح فریسیوں صدوقیوں اور راستبازوں کے لئے کھلے تھے۔ اسی طرح محصول لینے والوں ، گنہگاروں اور کسبیوں کے لئے کھلے تھے۔ کلمتہ اللہ کے "راستباز" پیرو جنہوں نے فریسی خیالات اور حلقوں میں پرورش پائی تھی ان "گنہگار" اشخاص کے ساتھ جن سے وہ پہلے دامن کش رہتے تھے نہایت آزادانہ اور بے باک ہو کر ملتے اور ان سے صحبت رکھتے تھے۔

کلمتہ اللہ کے اقوال وافعال نے یہ ثابت کردیا کہ خدا کی لازوال محبت گنہگاروں کی تلاش میں رہتی ہے(لوقا ۱۵: ۴، ۸)اورہمارے آسمانی باپ کے دل میں کامل محبت جوش زن رہتی ہے ۔ اوروہ گنہگاروں کو پھر اپنے سینہ کے ساتھ لگانے کا منتظر رہتا ہے(لوقا ۱۵: ۲۰)آپ نے فرمایا کہ خدا تمام تائب گنہگاروں کو مرحبا کہتا ہے جو اس کی لازوال محبت پر نظر کرکے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ کیونکہ اسی ایک مقصد کی خاطر خدا انسانی زندگی میں کام کرتا ہے اور اس کی محبت اسی مبارک انجام کا انتظار کرتی رہتی ہے(لوقا ۱۵: ۷، ۲۰، ۲۲)۔ کلمتہ اللہ کی خوشخبری کی یہ حقیقت بالکل نئی بات تھی ۔ چنانچہ یہودی عالم ڈاکٹر مانٹی فیوری کہتا ہے" یقیناً یہ ایک نئی بات ہے جس کی نظیر ہم کو نہ تو عہد عتیق کی کتب میں اور نہ طالمود میں نظر آتی ہے ۔ نہ تو انبیاء سابقین اور نہ زمانہ سلف کے یہودی ربی اس حقیقت کو پہنچ سکے۔ ان تصانیف میں توبہ کی تعریف کی گئی ہے۔ لیکن ان میں گنہگار کی تلاش کا نام تک موجود[67] نہیں"۔ پھر ایک اورجگہ یہی فاضل مصنف کہتا ہے کہ " گنہگار کو تلاش کرکے ڈھونڈھنا اور بدکرداروں سے ترک موالات کرنے کی بجائے میل جول پیدا

[67] Mortiz Friedlander quoted by Anderson Scott in New Testament Ethics p.42.

کرنا اوران کی نجات کی خاطر ان سے محبت پیار کرنا، میرے خیال میں یہ باتیں ایسی تھیں جو بنی اسرائیل کی تاریخ میں بالکل نئی تھیں[68] نہ گنہگار کلمتہ اللہ کے پاس محض آپ کی تعلیم سے بہرہ اندوز ہونے کی خاطر نہیں آتے تھے۔ بلکہ وہ آپ کے پاس آتے تھے کیونکہ آپ ان کو نہایت خندہ پیشانی سے قبول کرکےان کو خدا کے پاس لاتے تھے۔ فریسی گنہگاروں کے گناہوں کو تو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ لیکن گنہگاروں کی روحوں کو فراموش کردیتے تھے۔ ابن اللہ ان کے گناہوں کو نظر انداز کرکے ان کی بیش قیمت روحوں کی پرواہ کرتے تھے۔ آپ کی خوشخبری محض الہیٰ مغفرت کے اعلان پر ہی مشتمل نہیں تھی بلکہ آپ عملی طور پر اس اعلان کو ان کے سامنے پیش کرکے ان کے بہتر جذبات کو اپیل کرتے ان کی تلاش کرکے اورانکے ساتھ رفاقت اور میل جول رکھ کر ان کی توبہ اورالہیٰ مغفرت کی طرف راغب کرتے تھے ۔ مرزا صاحب قادیانی کے مندرجہ بالااعتراض کے جواب میں ہم یہودی فاضل ڈاکٹر مانٹی فیوری کے الفاظ نقل کرتے ہیں تاکہ دورِ حاضرہ کے مومن مسلمان بلکہ ملہم نبی اہلِ یہود سے جن کو قرآن "ناخلف " اور" سیاہ باطن" قراردیتا ہے ایمانداری اور صداقت پسندی سیکھیں۔ یہ عالم کہتاہے کہ " جس طرز سے اور جس سرگرمی سے سیدنا مسیح نے نجات کا پیغام ان لوگوں کو (یعنی گنہگاروں اور کسبیوں کو) پہنچایا وہ اسرائیل میں ایک نئی بات تھی۔ سیدنا مسیح خود گناہ سے مبرا تھا لیکن اس وجہ سے اس نے گوشہ نشینی اختیار نہ کی اور نہ گنہگاروں سے کنارہ کش رہا۔ ایک طرف اس نے محصول لینے والوں اور کسبیوں سے میل جول رکھا اوردوسری طرف اس نے کوڑھی ، مجنون، اور آسیب زدہ لوگوں کو شفا بخشی جواپنے گناہوں کی سزا لئے پھرتے تھے اگرچہ وہ ایک نبی تھا تاہم وہ کسبیوں سے دامن کش نہیں رہتا تھا-وہ جانتا تھا کہ ان کے چھونے سے اس کی پاکیزگی میں کسی قسم کا فرق نہیں آئیگا۔ کسبیوں کے ہاتھ لگانے سے اس کے دل میں بُرے خیال پیدا نہیں ہوتے تھے وہ گنہگاروں کو ہمیشہ شفا بخشتا تھا۔ لیکن ان کے گناہوں سے اس کو سخت نفرت تھی ۔ یہ لوگ اس کے پاس بھاگے آتے تھے اوراس کے پاس آکر وہ اپنے گناہوں کی نجاست میں قائم نہیں رہتے تھے بلکہ اس سے نجات پاتے تھے۔ اس کے ہمعصر اس کو ازاراہِ طعن وتشنیع "گنہگاروں کا یار" کہتے تھے۔ لیکن درحقیقت اس سے زیادہ جلیل القدر خطاب سیدنا مسیح کے لئے تجویز ہی نہیں کیا گیا"[69]۔

[68] Montefiore, Synoptics Gospels. Vol.p.1xxviii.86 vol11.pp.574-985

[69] Montefiore Relgious Teaching of Jesus.p.57 See also his Spirt of Judisam in Beginnings of Christianity.pt.1.vol.1p.79

(۴)

فروتنی اور ایثار نفسی:

ابن اللہ نے فرمایا کہ اس دنیا میں جہاں درجہ بندی کی قیود موجود ہیں ہر شخص بڑا ہونا اور بڑا کہلانا چاہتا ہے لیکن آسمان کی بادشاہت میں فروتن، حلیم اور مسکین لوگوں کی زیادہ قدر ہے۔ کلمۃ اللہ کے یہودی شاگرد جو ایک دنیاوی سلطنت کے خواب دیکھ رہے تھے ۔ اسبات کے منتظر تھے کہ جب آسمان کی بادشاہت اس دنیا پر قائم ہوگی تو ان کا رتبہ بڑھیگا اور ان کی عزت افزائی ہوگی۔ لیکن کلمۃ اللہ نے ان کو حلیمی اور انکساری کا سبق پڑھایا اور فرمایا " تم جانتے ہو کہ جو اقوام عالم کے سردار سمجھے جاتے ہیں وہ ان پر حکومت چلاتے اور ان کے امیر ان پر اختیار جتاتے ہیں لیکن تم میں ایسا نہ ہوگا بلکہ جو تم میں بڑا ہونا چاہیے وہ تمہارا خادم بنے اور جو تم میں اول ہونا چاہے وہ سب کا غلام بنے"(مرقس ۱۰: ۴۲تا ۴۴)آپ کی زبانِ حقائق ترجمان نے یہ اصول قائم کیا کہ " جو تم میں بڑا ہے وہ تمہارا خادم بنے۔ جو کوئی اپنے آپ کو بڑا بنائیگا وہ چھوٹا کیا جائیگا اور جو اپنے آپ کو چھوٹا بنائیگا وہ بڑا کیا جائیگا "(متی ۲۳: ۱۱تا ۱۲) آپ نے خود اپنی زندہ مثال پیش کرکے فرمایا " مجھ سے سیکھو کیونکہ میں حلیم اور دل کا فروتن ہوں اور تمہارے درمیان خدمت کرنے والے کی مانند ہوں ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ خدمت کرے"(متی ۱۱: ۲۹۔ لوقا ۲۲: ۲۷۔مرقس ۱۰: ۴۵)۔

ع ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

چنانچہ اپنی زندگی کی آخری رات کھانے سے پہلے آپ نے اس عظیم الشان اصول کا عملی نمونہ اپنے شاگردوں کو دیا۔ آپ نے " دسترخوان سے اٹھ کر کپڑے اتارے اور رومال لے کر اپنی کمر میں باندھا۔ اس کے بعد برتن میں پانی ڈال کر صحابہ کرام کے پاؤں دھونے اور جو رومال کمر میں باندھا تھا اس سے پونچھنے شروع کئے۔ پھر آپ شمعون پطرس تک پہنچے ۔ اس نے آپ سے کہا اے مولا کیا آپ میرے پاؤں دھوتے ہیں؟ سیدنا عیسیٰ نے جواب میں اس سے فرمایا میں کرتا ہوں تم ابھی نہیں جانتے مگر بعد میں سمجھو گے۔ حضرت پطرس نے کہا آپ میرے پاؤں ابد تک کبھی دھونے نہ پائیں گے۔ سیدنا عیسیٰ نے جواب دیا کہ اگر میں تمہارے پاؤں نہ دھوؤں تو تم میرے شریک نہیں۔شمعون پطرس نے آپ سے کہا اے مولا صرف میرے پاؤں ہی نہیں بلکہ ہاتھ اور سر بھی دھودیں۔ سیدنا عیسیٰ نے اس سے فرمایا جو نہاچکا ہو اس کو پاؤں کے سوا اور کچھ دھونے کی حاجت نہیں بلکہ سراسر پاک ہے اور تم پاک ہو لیکن سب کے سب نہیں۔ چونکہ آپ اپنے پکڑوانے والے کو جانتے تھے اس لئے کہا تم سب پاک نہیں ہو۔پس جب آپ ان کے پاؤں دھوچکے اور اپنے کپڑے پہن کر پھر بیٹھ گئے تو ان سے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہارے

ساتھ کیا کیا ؟ تم مجھے استاد اور مولا کہتے ہو اور خوب کہتے ہو کیونکہ میں ہوں۔ پس جب مجھ مولا اور استاد نے تمہارے پاؤں دھوئے تو تم پر بھی فرض ہے کہ ایک دوسرے کے پاؤں دھویا کرو۔(یوحنا۱۳ : ۱۴تا۱۵)۔

ابن اللہ نے شاگردوں کو یہ تعلیم دی کہ جو فروتن ہیں در حقیقت مبارک ہیں(متی ۵: ۵) یہ تعلیم دنیائے اخلاق میں بالکل نئی تھی۔ ارسطو کہتاہے کہ بہترین انسان وہ ہے جو اپنی نیکی اور راستبازی سے آگاہ ہو کر دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے وہ اپنے سے اعلیٰ آدمیوں کی طرف متکبرانہ انداز سے دیکھتا ہے اوراپنے سے ادنیٰ لوگوں کو بندہ نوازی کی نگاہ سے دیکھتا[70] ہے۔لیکن کلمۃ اللہ کی تعلیم اس کے بالکل برعکس ہے۔ جو شخص اپنے پڑوسی سے اپنی مانند پیار کرتاہےوہ نہ تو کسی سے تکبر کے ساتھ پیش آتا ہے اور نہ کسی کی تحقیر کرتاہے بلکہ وہ دوسروں کی خوبیوں کی قدر کرتاہے اوران کی تقصیروں کی وجہ سے ان کی تحقیر نہیں کرتا بلکہ ان پر ترس کھاتا ہے اور خود فروتن حلیم اور منکسر المزاج ہوجاتاہے ۔ حقیقی محبت اس بات کی متقاضی ہے کہ بڑا چھوٹے کی خدمت کرے۔ کلمۃ اللہ کی تعلیم کے مطابق فروتنی درحقیقت خود فراموشی ہے حلیم شخص دوسروں کی خدمت میں اپنا وجود بھول جاتاہے وہ جو حلیم اور دل کا فروتن تھا"(متی ۱۱: ۲۹) اس نے " اپنے آپ کو خالی کردیا اور خادم کی صورت اختیار کی اورانسانوں کے مشابہ ہو گیا۔ اورانسانی شکل میں ظاہر ہو کر اپنے

[70]Aristole, Nic Ethics 4.3

آپ کو پست کردیا اوریہاں تک فرمانبردار رہا کہ موت بلکہ صلیبی موت گوارا کی (فلپیوں ۲: ۸)۔

ع　　خاک شوپیش ازاں کہ خاک شوی

کلمۃ اللہ نے خود کامل نمونہ پیش کرکے اپنے شاگردوں کو بھی فرمایا" اگر کوئی میرے پیچھے آنا چاہے تواپنی خودی سے انکار کرے اورہر روز اپنی صلیب اٹھائے اورمیرے پیچھے ہولے کیونکہ جو کوئی اپنی جان بچانی چاہے وہ اسے کھوئیگا اور جو کوئی میرے اورانجیل کے واسطے اپنی جان کھوئے وہی اسے بچائیگا۔ جو اپنی جان کو عزیز رکھتاہے وہ اسے کھودیتا ہے اورجو دنیا میں اپنی جان سے عداوت رکھتاہے وہ اسے ہمیشہ کی زندگی کے لئے محفوظ رکھیگا"(لوقا ۹: ۲۳تا۲۵۔مرقس ۸: ۳۳تا۳۷۔ یوحنا ۱۲: ۲۴تا۲۶)۔

یہ الفاظ ایسے نہ تھے جو اپنا اثر کئے بغیر رہتے۔ گو اہل یہود نفس کشی اور ایثار نفسی کے نام سے ناآشنا نہ تھے لیکن "دنیائے اخلاق میں پہلی دفعہ یہ اصول ایسے واضح الفاظ میں بیان ہواہے یہ ایک ایسی بانگ تھی جو پہلے کبھی ایسے واضح اور موثر طریق سے سنائی نہ گئی تھی۔ ایثار نفسی کے مسیحی تصور میں اخلاقی قابلیت کے نت نئے مظاہرے پائے گئے[71] "۔ فاضل ڈاکٹر مانٹی فیوری کہتا ہے کہ الفاظ "اپنی خودی کا انکار کرے" میں ایک نیا تصور موجودہے سیدنا مسیح سے پہلے خودانکاری کے اصول سے لوگ بالکل ناواقف نہ تھے۔ لیکن ایثار نفسی کا

[71] Montefiore Religious Teachings of Jesus p.107

یہ صاف مفہوم اوراس کا متعلقہ نصب العین میرے خیال میں بالکل نئے تھے اورانہوں نے انسانی خیالات جذبات اور افعال کو بے حد متاثر کیا ہے"[72]۔

(۵)

عیب جوئی کی ممانعت:

انسانی تعلقات میں محبت کی مقراض عیب جوئی ہے۔ پس کلمۃ اللہ نے تعلیم دی کہ "عیب جوئی نہ کرو کہ تمہاری عیب جوئی نہ کی جائے ۔ کیونکہ جس طرح تم عیب جوئی کرتے ہو اسی طرح تمہاری بھی عیب جوئی کی جائیگی۔ اور جس پیمانے سے تم ناپتے ہو اسی سے تمہارے واسطے ناپا جائیگا۔ تو کیوں اپنے بھائی کی آنکھ کے تنکے کو دیکھتاہے اوراپنی آنکھ کے شہتیر پر غور نہیں کرتا ؟ اورجب تیری ہی آنکھ میں شہتیر ہے تو تو اپنے بھائی سے کیونکر کہہ سکتاہے کہ لاتیری آنکھ میں سے تنکا نکال دوں؟ اے ریاکار۔ پہلے اپنی آنکھ میں سے تو شہتیر نکال پھر اپنے بھائی کی آنکھ میں سے تنکے کو اچھی "طرح دیکھ کر نکال سکیگا"(متی ۷: ۱ تا ۵)۔

سیدنا مسیح کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں نہیں چاہیے کہ ہم اپنے آپ کو منصف قرار دے کر دنیا جہان کے اقوال اور افعال پر فتوے صادر کیا کریں۔ آپ نے فرمایا" کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا (مرقس ۱۰: ۱۸) انسان

[72]Montefiore ,Synoptic Gospels vol.1.p.291 Italics are his.

ضعیف البیان کمزور ہے۔ پس ہم خواہ مخواہ فتوےٰ قائم کرنے سے پرہیز کریں اور لوگوں پرازراہ محبت ترس کھائیں تا کہ وہ اپنی زندگی کی اصلاح کرسکیں۔

کلمۃ اللہ کی زندگی کا ایک واقعہ انجیل چہارم میں مرقوم ہے جو اس حکم کی بہترین مثال ہے لکھاہے کہ ایک دفعہ منجی عالمین صبح سویرے ہیکل میں تعلیم دے رہے تھے اور " اورعالم شرع اور دینی علماء ایک عورت کو لائے جو زنا میں پکڑی گئی تھی اور اسے بیچ میں کھڑا کرکے آپ سے کہا : استاد محترم یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے ۔ توریت میں موسیٰ نے ہم کو حکم دیاہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں۔ پس آپ اس عورت کی نسبت کیا فرماتے ہیں؟ انہوں نے آپ کو آزمانے کے لئے یہ کہا تا کہ آپ پر الزام لگانے کا کوئی سبب نکالیں مگر سیدنا عیسیٰ جھک کر انگلی سے زمین پر لکھنے لگے۔ جب وہ آپ سے سوال کرتے ہی رہے توآپ نے سیدھے ہو کر ان سے فرمایا جو تم میں بے گناہ ہو وہی پہلے اس کے پتھر مارے۔ اور پھر جھک کر زمین پر انگلی سے لکھنے لگے ۔ وہ یہ سن کر بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک ایک ایک کر نکل گئے اورسیدنا عیسیٰ اکیلے رہ گئے اور عورت وہیں بیچ میں رہ گئی ۔ آپ نے سیدھے ہو کر اس سے فرمایا اے خاتون یہ لوگ کہاں گئے ؟ کیا کسی نے تم پر حکم نہیں لگایا ؟ اس نے کہا اے مولا کسی نے نہیں۔ سیدنا عیسیٰ نے فرمایا میں بھی تم پر الزام نہیں لگاتا ۔ جاؤ پھر گناہ نہ کرنا ۔(یوحنا ۸: ۳تا ۱۱)۔فقیہ اور فریسی اس عورت کی "آنکھ کے تنکے" کو نہایت باریک بینی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے لیکن اپنی "آنکھ

کے شہتیر پر غور" نہیں کرتے تھے سیدنا مسیح کے اعجازی الفاظ نے ان کے دلوں کو تیر کی مانند چھیدا اور ان کو اپنی گھنونی حالت نظر آئی لیکن وہ توبہ کئے بغیر وہاں سے چل دیئے اور یہ عورت اپنے گناہوں کی مغفرت حاصل کرکے کلمۃ اللہ کے حضور سے گئی۔

آپ نے یہ تعلیم دی کہ جلد بازی سے کسی شخص کے خلاف کچھ نہ کہنا چاہیے۔ ایک دفعہ آپ کے ایک شاگرد نے ایک شخص کو دیکھا جو آپ کے نام سے بدروحوں کو نکال رہا تھا لیکن چونکہ وہ آپ کے حواریوں میں سے نہ تھا۔ یوحنا اس کی طرف سے بدگمان ہوا اور شاگردوں نے اس شخص کو منع کیا۔ سیدنا مسیح نے ان کی جلد بازی کی وجہ سے ان کو جھڑکا اور فرمایا"۔ اسے منع نہ کرو، کیونکہ ایسا کوئی نہیں جو میرے نام سے معجزہ دکھائے اور مجھے جلد بُرا کہہ سکے۔ اس لئے جو ہمارے خلاف نہیں وہ ہماری طرف ہے"(مرقس ۹: ۳۹تا ۴۰)۔

ایک دفعہ کلمۃ اللہ اور آپ کے شاگردوں کو سامریوں نے مخالفت کی وجہ سے اپنے گاؤں میں ٹکنے نہ دیا۔ وہ اہلِ یہود کی طرف سے بدگمان تھے اور ان کا خیال تھا کہ چونکہ سیدنا مسیح اور شاگرد بھی یہودی ہیں لہذا وہ بھی ان کے دشمن ہونگے اس جلد بازی کا جواب یعقوب اور یوحنا نے تُرکی بترُکی دینا چاہا اور جلد بازی کی وجہ سے عرض کی" ۔ مولا آپ حکم دیں تو ہم (الیاس نبی کی طرح) آسمان سے آگ نازل کروا کر ان لوگوں کو بھسم کردیں۔ لیکن آپ نے مڑ کر دیکھا اور انہیں جھڑک دیا اور کہا کہ تم نہیں جانتے کہ تم کیسی روح کے ہو۔ کیونکہ ابن آدم لوگوں کو ہلاک کرنے نہیں بلکہ بچانے آیا ہے(لوقا ۹: ۵۴تا ۵۶) کلمۃ اللہ کی روح، محبت، صلح اور آشتی کی روح ہے اور آپ نے اپنے شاگردوں کو غصہ، عناد اور بدگمانی کی روح کے خلاف خبردار فرمایا کیونکہ یہ محبت کے عین نقیض ہے۔

(۶)

عفو کی تعلیم:

موسوی شریعت میں انتقام کے جذبہ کی اجازت تھی چنانچہ حکم تھا کہ " توجان کے بدلے جان اور چوٹ کے بدلے چوٹ "(خروج ۲۱: ۲۳تا ۲۵)جیسا کوئی کسی کا نقصان کرے اس سے ویسا ہی کیا جائے "(احبار ۲۴: ۲۰)۔ کتب سابقہ کی تعلیم ہی یہ تھی کہ" اپنے پڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت (متی ۵: ۴۳، زبور ۱۱۸: ۷، ۱۱۲: ۸، ۹- ۲۴: ۱۸ وغیرہ)لیکن جب کوئی شخص بدی کا بدلہ بدی سے لیتا ہے تو وہ بدی کو مٹانے کے عوض دنیا میں برائی کا اضافہ کرتا ہے برائی سے برائی کبھی مغلوب نہیں ہوسکتی یہی وجہ ہے کہ کلمۃ اللہ نے حکم دیا کہ بدی کو نیکی سے مغلوب کرو۔آپ نے فرمایا " شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے"(متی ۵: ۳۹)لوگ حیران ہو کر پوچھتے ہیں کیا یہ ہوسکتا ہے؟لیکن آج ہمارے وطن میں یہ مقبول شدہ اصول

ہے اور سیاسی حلقوں میں "ستیہ گروہ" کے نام سے موسوم ہے سور گیہ مہاتما گاندھی کی یہی تعلیم تھی کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دو بلکہ جس شے کو تم براخیال کرتے ہواس کو نیکی سے مغلوب کرو۔مثلاً گروکے باغ امرتسر میں ۱۹۲۲ء میں قوی ہیکل سکھ پولیس کی مارپیٹ نہ صرف برداشت کرتے تھے بلکہ " دوسرا گال" بھی پھیر دیتے تھے۔ سکھوں نے باوجود مارپیٹ کے حکومت کا مقابلہ نہ کیا۔ اور جس شے کووہ برا سمجھتے تھے اس کا جواب برائی سے نہ دیا۔ لاہور کے اسلامی روزنامہ اخبار زمیندار نے اس زبردست حقیقت کو ذیل کے الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔" محکموں کے پاس ضبط وانضباط کے ساتھ ایثار وقربانی کی متحدہ طاقت کا مظاہرہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے آگے بڑی سے بڑی جاہ وجلال اور غرور ونخوت والی حکومت گھٹنے ٹیک دیتی ہے اور نیاز مندانہ دست بستہ محکموں کے آگے کھڑی ہو کر ان کی آرزوں کا پورا کرنا تخت وتاج کی بقا کے لئے ضروری سمجھتی ہے"(۱۷ نومبر ۱۹۲۹ء) یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ اہل اسلام بھی جن کی کتاب قرآن میں موسوی شریعت کااصول لفظ بلفظ درج ہے اورجو کلمۃ اللہ کی عفو کی تعلیم کوناقابل عمل قرار دیا کرتے تھے اب اس اصول کے صحیح ہونے کا اقبال کررہے ہیں کہ " شریر کا مقابلہ نہ کرنا"۔ اسی زریں اصول کی طفیل ہمارے ملک کو برطانیہ جیسی زبردست طاقت کے پنجہ سے آزادی نصیب ہوئی ۔سور گیہ مہاتما گاندھی نے اور خان عبدالغفار خان نے ہندوستان کے طول وعرض میں یہ منادی کردی کہ برطانوی سامراج کا تشدد کے ہتھیاروں سے مقابلہ نہ کیا جائے بلکہ کلمۃ اللہ کے پہاڑی وعظ کے اس حربہ کا استعمال کیا جائے کہ" شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دعا مانگو"۔ہندوستان کے کروڑوں باشندوں نے ان اصول پرایسا عمل کیا کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی اور انگریزوں کےلئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ ہمارے ملک کوآزاد کردیں اور خود یہاں سے چل دیں۔

مذکورہ بالاواقعات ثابت کرتے ہیں کہ سیدنا مسیح کے زریں اصول نہ صرف افراد کے لئے ہی قابل عمل ہیں۔ بلکہ ان کا اطلاق گروہوں، جماعتوں اورملکوں پر بھی ہوسکتاہے۔ ان سے ہم کو پتہ چلتاہے کہ جب کبھی افراد اور ممالک اس زریں اصول پرچلے تو ان کے سماجی ، معاشرتی ، ملکی اور سیاسی مسائل کا حل ہوگیا اور کہ یہ اصول بین الاقوامی تعلقات کوایک محکم بنیاد پر قائم کرنے کاواحد ذریعہ ہیں۔ مسیحی مذہب کی تاریخ کا ہر صفحہ اس اصول کی بہترین مثالوں سے خونیں حرفوں میں لکھا ہے۔ مورخ لیکی کہتاہے کہ رومی قیاصرہ کے زمانہ میں " تعذیب وعقوبت کی وہ وہ صورتیں جن کے ذکر سے بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کبر السن مردوں اور ضعیف الجبثہ عورتوں پر برابر استعمال کی جاتی تھیں اور مظلوموں کی جانب سے استقلال اور پامردی کےوہ نمونے پیش ہوتے تھے جوآج تک دنیاکے لئے باعثِ حیرت[73] ہے۔

---

[73] Lecky .O.P.Cit.vol1.p.372.

زخم ہا برداشتیم وفتح ہا کردیم لیک
ہر گزازخون کسے رنگیں نہ شد داماں!

یہی مورخ ایک اورجگہ کہتاہے "مسیحی لوہے کی سرخ انگارہ کرسیوں پر بٹھلائے جاتے اورانکے بھنتے ہوئے گوشت سے دھواں اٹھتا تھا۔ ان کا گوشت لوہے کے کانٹوں کی مدد سے ان کی ہڈیوں سے کھرچاجاتا تھا ایک عضو دوسرے سے کاٹ کرالگ کیا جاتا تھا اوراس میں جلتا ہواسیسہ پلادیا جاتا تھا۔ ان زخموں پر نمک مرچ اور سرکہ ڈالاجاتا تھا یہ عذاب سارے سارے دن جاری رکھے جاتے تھے اور مرد اور عورتیں بلکہ کمزورنازک لڑکیاں تک انہیں برداشت کرتی تھیں[74]۔

کلمۃ اللہ نے عفو کی تعلیم دی اور فرمایا کہ اگر کسی شخص نے تمہارے خلاف قصور کیا ہے توجس طرح خدا کے قصور وارہو کر الہیٰ مغفرت کے امیدوار ہواسی طرح تم بھی اپنے قصورواروں کو معاف کروآپ نے فرمایا کہ " اگر تم آدمیوں کے قصورمعاف کروگے تو تمہاراآسمانی باپ بھی تمہیں معاف کریگا۔اور اگر تم آدمیوں کے قصور معاف نہ کروگے تو تمہاراآسمانی باپ تمہارے قصور معاف نہ کریگا"(متی ۶: ۱۴تا ۱۵)۔اسی واسطے آپ نے اپنی مختصر دعامیں ہم کو سکھلایا کہ ہم خدا سے عرض کریں کہ اے باپ" جس طرح ہم نے اپنے قصورواروں کو معاف کیاہے توبھی ہمارے گناہ ہمیں معاف فرما"(متی ۶:

[74] Ibid vol.1.p.391.

۱۲)۔ کلمۃ اللہ مظلوم کو فرماتے ہیں کہ تجھ پر ظالم نے ظلم وستم ڈھایاہے۔ لیکن تو اس موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دے بلکہ اس کو اپنی اورظالم دونوں کی روحانی ترقی کا وسیلہ بنا۔(متی ۱۸: ۱۵)انتقام کے جذبہ پر غالب آ، ظالم کو معاف کر اوراس سے اپنی مانند محبت رکھ تاکہ وہ اور تو دونوں باپ کی محبت میں کامل ہوجاؤ۔ آپ نے فرمایا کہ " جب کبھی تم کھڑے ہوئے دعا مانگتے ہو"۔ اگر تم کو کسی سے کچھ شکایت ہو تو اسے معاف کرو۔ تاکہ تمہارا باپ بھی جو آسمان پر ہے ۔ تمہارے قصور معاف کرے اور اگر تم معاف نہ کروگے تو تمہارا باپ جوآسمان پر ہے تمہارے قصور بھی معاف نہ کریگا"(مرقس ۱۱: ۲۵تا ۲۶)۔

عفو کی تعلیم کلمۃ اللہ کی خصوصی تعلیم ہے عہد عتیق میں صدیوں کے دوران میں یہ آواز گاہے گاہے اس طرح سنائی دیتی ہے جیسے بیابان میں کوئی آواز آئے (خروج ۲۳: ۴، امثال ۲۰: ۲۲۔ ۲۵: ۲۱۔ ایوب ۳۱: ۲۹) کتبِ عہدعتیق میں خدا کی معافی کی تعلیم ہم کو ضرور ملتی ہے خدا تو معاف کرتاہے لیکن معافی یافتگان کےلئے اپنے قصورواروں اور دشمنوں کو معاف کرنا لازمی نہ تھا۔ وہ خدا سے معافی حاصل کرکے بھی اپنے دلوں میں اپنے دشمنوں کے خلاف کینہ اور غضب کے جذبات رکھ سکتے تھے[75] (زبور ۱۳۷: ۶، ۹۔

[75] Montefiore Spirit of Judisam in Beginnings of Christianity pt.1vol.1.p.77.

۵۴: ۴، ۷) مابعد کے زمانہ میں یہودی ربی کہتے تھے کہ اگر کوئی شخص کسی کا قصور کرے تو تین دفعہ اس کو معاف کیا جائے۔ سیدنا مسیح نے فرمایا کہ" اگر تیرا بھائی گناہ کرے اسے ملامت کر، اگر توبہ کرے اسے معاف کراور اگر وہ ایک دن میں سات دفعہ تیرا گناہ کرے اور ساتوں دفعہ تیرے پاس پھر آکر کہے کہ توبہ کرتا ہوں تواسے معاف کر"(لوقا ۱۷: ۳، ۴)سیدنا مسیح کا مطلب یہ تھا کہ تواپنے قصوروار بھائی کو جب وہ توبہ کرے ہمیشہ معاف کرلیکن بعض شاگردوں نے خیال کیا کہ یہودی ربیوں کی طرح آپ نے بھی ایک حد مقرر کردی ہے۔ پطرس آپ کے پاس آیا اور پوچھا کہ میں اپنے بھائی کو ایک دن میں سات مرتبہ معاف کروں توسیدنا مسیح نے جواب میں فرمایا میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ سات دفعہ بلکہ سات دفعہ کے ستر گنے تک"(متی ۱۸: ۲۱، ۲۲) آپ کا مطلب یہ تھا کہ خدا باپ ہم کو ہر دفعہ جب ہم اس کے حضور توبہ کرتے ہیں تو معاف فرماتا ہے۔

ع خون دوہزار توبہ بر گردن ماست

لیکن پھر بھی خدا ہم کو ہمیشہ معاف کرتا ہے اسی طرح ہمارے عفو کی بھی کوئی حد نہیں ہونی چاہیے۔

اس حقیقت کوواضح کرنے کے لئے کلمۃ اللہ نے ایک تمثیل سنائی اور فرمایا" آسمان کی بادشاہی " اس بادشاہ کی مانند ہے جس نے اپنے نوکروں سے حساب لینا چاہا۔ اور جب حساب لینے لگا تو اس کے سامنے ایک قرض دار حاضر کیا گیا جس پر اس کے دس ہزار توڑے آتے تھے۔ مگر چونکہ اس کے پاس ادا کرنے کو کچھ نہ تھا اس لئے اس کے مالک نے حکم دیا کہ یہ اور اس کی بیوی بچے اور جو کچھ اس کا ہے سب بیچا جائے اور قرض وصول کرلیا جائے۔ پس نوکرنے گر کر اسے سجدہ کیا اور کہا اے مالک مجھے مہلت دیجئے، میں آپ کا سارا قرض ادا کردوں گا۔ اس نوکر کے مالک نے ترس کھا کر اسے چھوڑدیا اور اس کا قرض بخش دیا۔ جب وہ نوکر باہر نکلا تو اس کے ہم خدمتوں میں سے ایک اس کو ملا جس پر اس کے سو دینار آتے تھے۔ اس نے اس کو پکڑ کر اس کا گلا گھونٹا اور کہا جو میرا آتا ہے ادا کردو۔ پس اس کے ہم خدمت نے اس کے سامنے گر کر اس کی منت کی اور کہا مجھے مہلت دیں، میں آپ کو ادا کردوں گا۔ اس نے نہ مانا بلکہ جا کر اسے قید خانہ میں ڈال دیا کہ جب تک قرض ادا نہ کردے قید رہے۔ پس اس کے ہم خدمت یہ حال دیکھ کر بہت غمگین ہوئے اور آکر اپنے مالک کو سب کچھ جو ہوا تھا سنا دیا۔ اس پر اس کے مالک نے اس کو پاس بلا کر اس سے کہا اے شریر نوکر! میں نے وہ سارا قرض تمہیں اس لئے بخش دیا کہ تم نے میری منت کی تھی۔ کیا تمہیں لازم نہ تھا کہ جیسا میں نے تم پر رحم کیا تم بھی اپنے ہم خدمت پر رحم کرتے ؟ اور اس کے مالک نے خفا ہو کر اس کو جلادوں کے حوالہ کیا کہ جب تک تمام قرض ادا نہ کردے قید رہے۔(متی ۱۸: ۲۳تا ۳۴)۔

یہ تمثیل سنا کر کلمۃ اللہ نے فرمایا " اسی طرح تمہارے ساتھ میرا آسمانی باپ بھی کریگا۔ اگر تم میں سے ہر ایک اپنے بھائی کو دل سے معاف نہ

کرے"(متی ۱۸: ۳۵)۔ کیونکہ خدا کو ہم تب معاف کرے گا۔ جب ہمارا دل توبہ کے ذریعہ نرم اور محبت سے پُر ہو گا۔ لیکن جو شخص اپنے بھائی کو معاف نہیں کرتا اس کا دل سخت اور انتقام کے خیال سے بھرا ہوتاہے۔وہ ایسا دل رکھتے ہوئے الہٰی مغفرت کی کس طرح قدر کرسکتا ہے؟ عفو محبت کا نتیجہ ہے اور اگر کوئی شخص اپنے بھائی کو معاف نہیں کرتا تووہ محبت سے بیگانہ ہے۔ وہ اپنی زندگی کو اس الہٰی رفاقت سے دور رکھتا ہے جو گناہوں کی مغفرت سے ہم کو حاصل ہوتی ہے کیونکہ" اگر ہم ایک دوسرے سے محبت رکھتےہیں۔ تو خدا ہم میں رہتاہے"۔(۱۔یوحنا ۴: ۱۲) اور " جو کوئی محبت رکھتاہے وہ خدا سے پیدا ہوا ہے"۔ (۱۔یوحنا ۴: ۸)پس اگر ہم اس الہٰی خاندان میں قائم رہنا چاہتےہیں تولازم ہے کہ اپنے بھائیوں کو معاف کرکے ان سے اخوت کا رشتہ قائم رکھیں (۱۔یوحنا ۴: ۲۰)۔

مذکورہ بالا تمثیل میں دونوں قرضداروں کو قرضوں کی مقدار قابلِ غور ہے نوکر نے بادشاہ کے ساڑھے تین کروڑ سے زیادہ روپیہ دینے تھے۔ لیکن اس کے اپنے ہم خدمت نے پچاس سے بھی کم روپیہ دینے تھے۔ پس کلمتہ اللہ کا مطلب یہ ہے کہ خداہمارے کروڑوں قصور معاف کرتاہے۔ پس ہم کو لازم ہے کہ ہم بھی اپنے بھائیوں کے تھوڑے سے قصور معاف کیا کریں۔" خداوند رحیم اور کریم ہے قہر کرنے میں دھیما اور شفقت میں غنی ہے وہ ہمارے گناہوں کے موافق ہم سے سلوک نہیں کرتا اورہماری بدکاریوں کے مطابق ہم کو بدلہ نہیں دیتا"۔ اگر وہ ہماری بدکاری کو حساب میں لائے تو کون اس کے حضور قائم رہ سکتاہے پر جیسے پورب پچھم سے دورہے ویسے ہی اس نے ہماری خطائیں ہم سے دور کردیں ۔ جیسے باپ بیٹوں پر ترس کھاتا ہے ویسے ہی خداوند ہم پر ترس کھاتاہے"(زبور ۱۰۳: ۱۳۰)۔

مری بندگی سے میرے جرُم افزوں
تیرے قہر سے تیری رحمت زیادہ

پس ہم پر بھی لازم ہے کہ ہم جو الہٰی مغفرت کے امیدوارہیں۔ اپنے قصورواروں کو تہ دل سے معاف کیا کریں۔

جس طرح کلمتہ اللہ نے عفو کی تعلیم دی اسی طرح آپ نے اس تعلیم پر کاربند ہو کر ایک نیا نمونہ بنی نوع انسان کے سامنے رکھا۔ چنانچہ جب آپ کے دشمن جو آپ کے خون کے پیاسے تھے آپ کے جسمِ اطہر میں کیلیں ٹھونک رہے تھے تو اس جانکنی کے وقت آپ نےاپنی مبارک زبان سے ان کے لئے دعائے خیر فرمائی اورکہا " اے باپ ان کو معاف کر کیونکہ یہ جانتے نہیں کہ کیا کرتےہیں"(لوقا ۲۳: ۳۴)۔

افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ اخلاق میں اور ہندوؤں کے فلسفہ کرم میں توبہ اور معافی کو کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ لیکن آج دنیائے اخلاق نے کلمتہ اللہ کے عفو کے اصول کو قبول کرلیاہے۔ تمام انسان ایسے شخص کو مرحباکہتے ہیں جو خلوصِ قلب سے اپنے دشمن کو معاف کرتاہے ۔ اگر کوئی شخص ہمارے پاس

آئے اور نہ دل سے اپنی تقصیروں کی معافی کا طلب گار ہو تو ہم اس کو ضرور معاف کرتے ہیں۔اوراگر معاف نہیں کرتے تو دنیا ہم کو برا کھتی اور براجانتی ہے ۔ یہ ایک عامیانہ خیال ہے کہ جو شخص ہم سے بد ترین سلوک روا رکھ سکتا ہے وہ خلوصِ قلب سے توبہ کرہی نہیں سکتا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جتنا برا سلوک ہمارے ساتھ کیا جاتاہے معاف کرنا بھی نسبتاً مشکل ہوجاتاہے ۔ لیکن کلمة اللہ کی تعلیم کی روشنی میں معاف کرنا ہمارے لئے نہ صرف ایک احسن امر ہوگیا ہے بلکہ ہمارے فرائض میں شامل ہوگیاہے۔ اس تعلیم کا خمیر اس قدر تاثیر کرگیاہے ۔کہ جو شخص اس فرض کو پورا نہیں کرتاوہ دنیا کی نظر میں بھی براشمار ہونے لگ جاتا ہے کیونکہ اب انتقام ایک وحشیانہ جذبہ شمار کیا جاتاہے۔ پس کلمة اللہ کی تعلیم نے دنیائے اخلاق کی کایا پلٹ دی ہے۔

باب سوم

تعلیمِ مسیح دربارہ سلطنتِ الہٰی

(۱)

اہلِ یہود اور خدا کی بادشاہت:

یہود کا حضرت موسیٰ کے زمانہ سے کوئی دنیاوی بادشاہ نہیں تھا۔ ان کا یہ ایمان تھا کہ خدا خود ان کا بادشاہ ہے ۔(۱۔سیموئیل ۱۲: ۱۶تا ۱۹)اور کہ قومِ یہود خدا کی برگزیدہ قوم ہے(خروج ۲۴: ۷۔ ۱سیموئیل ۱۲: تا ۲۲ وغیرہ)ان کے بادشاہ یہوواہ نے کوہِ سینا پر ان کے لئے قوانین وضع کئے(خروج ۲۴ باب وغیرہ) خدا خود اپنی قوم کا سپہ سالار اور سرِ لشکر تھا جو ان کی جنگوں میں ان کا پیشوا تھا اہلِ یہود کی تاریخ میں دنیاوی لیڈر تھے لیکن وہ یہوواہ سلطان کے ماتحت تھے۔ بنی اسرائیل میں سے ساؤل پہلا شخص تھا جو بادشاہ چنا گیا(۱سیموئیل ۸باب) لیکن اس نے یا اس کے جانشین داؤد اوراس کی اولاد نے کبھی "رب خداوند بادشاہ" کی جگہ غضب نہ کی وہ حقیقی سلطان یہوواہ کے ماتحت اس کی برگزیدہ قوم کے ہادی تھے۔ جو اس کے واسطے بطور نائب کے امور سلطنت کو سر انجام دیتے تھے۔ (۲سیموئیل ۷باب) جب کبھی سلاطین یہود نے اس حقیقت کو فراموش کیا توانبیاء اللہ نے جووقتاً فوقتاً مبعوث ہوئے

اس حقیقت کو انہیں اور قوم اسرائیل کو بھولنے نہ دیا۔(۲۔سیموئیل ۱۲: ۱ تا ۱۲۔ ۱سلاطین باب ۱۳ ، باب ۱۸ وغیرہ)۔خداوند یہوواہ سرزمین اسرائیل کا بادشاہ تھا۔ جس کا پایہ تخت یروشلیم تھا جہاں کی ہیکل اس کا مقدس تھی۔

جب سلطنت یہود کو زوال آیا اور بت پرست اور مشرک بادشاہوں نے اس کو فتح کرکے یروشلیم کی ہیکل کو شہید ومسمار کردیا اور فاتحین یہودی امرا اور بادشاہ کو اسیری میں لے گئے تو قومِ یہود کو اس بات کا احساس ہوا کہ انہوں نے اپنے حقیقی سلطان یہوواہ سے بغاوت کی سزا پائی ہے ان کا ملک مفتوح ہوگیا۔ ان کا مایہ ناز شہر یروشلیم (زبور ۱۲۲) برباد ہوگیا۔ وہ خود جلاوطن ہوگئے۔جس ہیکل میں خدا سکونت گزیں تھا اور جس کے خلاف ایک لفظ بولنا کفر میں شامل تھا وہ نذرِ آتش ہوگئی۔اسیری کے جانکاہ سانحہ نے ان کی آنکھیں کھولیں اور ان پر یہ ظاہر ہوا کہ ان کا خدا صرف یروشلیم اوریہودیہ میں ہی نہیں رہتا بلکہ وہ زمان ومکان کی قیود کا پابند نہیں اور نہ کوئی خاص قوم یا کہانت یا ظاہری رسوم قربانی وغیرہ اس کی مقبول نظر ہیں۔ اور یہ بھی ان پر ظاہر ہوا کہ اگر قوم اسرائیل کسی خاص معنوں میں اس کی برگزیدہ قوم ہے۔ تو صرف اس لئے ہے کہ وہ دیگر اقوام میں خدا کے علم کی اشاعت کرے۔(عموس ۴: ۱۳۔۵: ۸۔ میکاہ ۴: ۱۔۳۔ یسعیاہ باب ۴۰، ۴۲، ۶۰ وغیرہ)۔تاکہ اقوامِ عالم بھی خدا کے نور سے مستفیض ہوسکیں۔ اس زمانہ کے انبیاء اور زبور نویس اس صداقت کو بار بار اہلِ یہود کے ذہن نشین کرتے تھے۔"میں خدا نے تجھے (اے اسرائیل) صداقت کے لئے بلایا ہے۔ میں لوگوں کے عہد اور قوموں کے نور کے لئے تجھے دونگا"۔" میں نے (اے اسرائیل) تجھ کو اقوامِ عالم کے لئے نور بخشا تاکہ تجھ سے میری نجات زمین کے کناروں تک بھی پہنچے"(یسعیاہ ۴۹: ۶)"میں اقوامِ عالم کو بھی اپنی عبادت گاہ میں شادمان کرونگا ۔کیونکہ میرا گھر ساری قوموں کی عبادتگاہ کہلائیگا (یسعیاہ ۵۶: ۶)نیز دیکھو حبقوق ۲: ۱۴۔ زبور ۲۲: ۲۷تا ۳۱۔ ۶۵: ۲تا ۵، ۸۶۔ ۹۔ ۸۷: ۴تا ۷۔ ملاکی ۱: ۱۱۔ یرمیاہ ۳۱: ۳۴وغیرہ)۔

ان خیالات کے ساتھ بعض ہادیانِ مذہب تعلیم بھی دیتے تھے کہ موجودہ اسیری ایک سزا ہے جو ان کو اوران کے بادشاہ کو خدا کی طرف سے الہیٰ شریعت اوراحکام کو فراموش کردینے کی وجہ سے ملی ہے۔ لیکن ایک دن آئیگا۔ جب وہ سزا بھگتنے کے بعد پھر اپنے وطن کو واپس جائینگے۔ اور خدا ان کو بحال کریگا اوران کی سلطنت از سر نو قائم ہوجائیگی۔ اوروہ اپنے تمام دشمنوں پر فتحیاب ہونگے۔ اور خدا ان کو اقوامِ عالم میں ایسی عزت عطا فرمائیگا کہ ان کی پہلی سلطنت کی رونق اورشان وشوکت ماند پڑجائیگی۔(صفنیاہ کی کتاب ۔ عموس ۹: ۱۱ وغیرہ) خدا از سر نو داؤد کی نسل میں سے ایک بادشاہ ان پر مقرر کریگا(میکاہ ۴: ۳)جو خدا کے نام میں اوراسکی قوت کے باعث راستبازی سے سلطنت کریگا۔(یسعیاہ ۹: ۶تا ۷وغیرہ) داؤد کی سلطنت تو مصر کی سرحد

سے دریائے فرات تک تھی۔ لیکن خدا کا یہ مسیح موعود" قوموں کا وارث ہوگا۔ اور زمین سراسر اس کے قبضے میں ہوگی اور وہ "کمہار کے برتن کی مانند" لوہے کے عصا سے " اقوام عالم کو کچلیگا (زبور ۲: ۸تا ۱۰ - دانی ایل ۲: ۴۴) اس کی سلطنت "ابدی بادشاہت " اور اس کی حکومت " پشت درپشت قائم رہیگی (زبور ۱۴۵: ۱۳)۔

اہل یہود مسیح موعود کے اس تصور کو اپنی قومی تاریخ میں اسیری کے بعد کبھی نہ بھولے۔ یونانی اور رومی فاتحین کے زمانہ میں بار بار یہی تصور ان کے پیش نظر رہا۔ کمالہ کا یہودا اور دیگر غیرت مند یہودی، فاتحین کے خلاف لشکر کشی کرتے رہے ان کو شکست پر شکست ملی۔ رومی زمانہ میں ان کی بغاوتوں کو بڑی سختی اور عقوبت کے ساتھ فرو کیا گیا۔ لیکن یہ تصور ان کے اذہان میں برابر قائم رہا۔ اور منجئی عالمین کے ہم عصر یہود اسی دنیاوی مسیح موعود کے منتظر تھے۔ جو ان کو رومی فاتحین کے پنجہ سے چھڑائیگا۔ اور مخلصی دلوا کر ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرکے ان پیشین گوئیوں کو پورا کریگا۔ جو کتبِ عہد عتیق میں مندرج تھیں۔ ان تصورات نے ہزاروں کے دل ودماغ پر قبضہ کیاہوا تھا۔ وہ آسمان کی طرف نظر اٹھائے رہتے تھے۔ اور ان کے نالہ وزاری کی فریاد ہر وقت جواب کی منتظر رہتی اور کہتی " اے نگہبان - رات کی کیا خبر ہے"(مرقس ۱۵: ۴۳۔ لوقا ۱۴: ۱۵ - ۱۷: ۲۰وغیرہ)ان میں ایک بڑی تعداد منظم تھی جو زیلوتیس (Zealots) کے نام سے موسوم تھی۔ لیکن ان کے علاوہ ہزاروں سرفروش ایسے تھے جو اس گھڑی کے منتظر تھے جب مسیح موعود ان کی تلوار چلانے کے لئے بلائیگا۔ ان کے سر میں ایک ہی خیال سمایا تھا کہ وہ مسیح موعود کے ماتحت ہزاروں دشمنانِ دین کو موت کے گھاٹ اتارینگے اور خدا کی بادشاہت کو قائم کرینگے انبیاء اللہ کے تمام پیغامات جو قوم کے نصب العین کے متعلق تھے بالائے طاق رکھ دیئے گئے قوم کے دشمنوں کے خلاف جنگ کرنا مذہبی فرائض کی ادائیگی خیال کیا گیا۔ دنیاوی سلطنت اور ثروت کے خواب اور قومی برگزیدگی کے خیالات نے اسیری کے سبق اور خداوندی ارشاد کو کہ" میں نے تجھے اقوامِ عالم کے لئے نور بخشا تاکہ تیرے ذریعہ میری نجات زمین کے کناروں تک پہنچے لوگوں کے دلوں سے محو کردیا۔ اور حرفِ غلط کی طرح مٹادیا۔

(۲)

حضرت یحییٰ اصطباغ دینے والے اور خدا کی بادشاہت

سیدنا مسیح کے پیش رو حضرت یحییٰ نے اس روحانی " بیابان " میں ایک مرتبہ پھر خدا کی اور اس خداوندی ارشاد کو دوبارہ اہل یہود پر جتلایا۔ جس کو وہ فراموش کرچکے تھے۔ آپ نے فرمایا توبہ کرو - کیونکہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے(متی ۳: ۲) جب خداوند کا یہ نذیر ظاہر ہوا تو لوگ جوق درجوق اس کے پاس آنے لگے۔ اس کا " آسمان کی بادشاہت" کا تصور اہل یہود کے خیال کے مطابق نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے ان کے برگزیدہ قوم ہونے کی

خام خیالی کو رفع کیا۔ اور بتایا کہ آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا کسی خاص شخص کی نسل ہونے پر موقوف نہیں۔ بلکہ توبہ اور راستبازی پر منحصر ہے۔ وہ ایک اخلاقی بادشاہت ہے جس کے شرکا کے لئے آلِ ابراہیم میں سے ہونا ضروری نہیں۔ آپ نے اہل یہود کو کہا" اپنے دلوں میں یہ خیال نہ کرو کہ ابراہیم ہمارا باپ ہے۔ اب درختوں کی جڑ پر کلہاڑا رکھا ہے۔ پس جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے(متی ۳: ۹تا ۱۰)آپ نے مسیح موعود کی خوشخبری دی اور کہا " میرے بعد وہ شخص آرہاہے جو مجھ سے زورآور ہے ۔ میں اس کی جوتیاں اٹھانے کے لائق نہیں "(متی ۹: ۱۱)۔

اس نذیر کے بعد جب دنیا کے بشیر نے اہلِ یہود میں خدمت کرنی شروع کی تو آپ نے ان کو " خدا کی بادشاہت" کی بشارت دی اور فرمایا کہ" وقت پورا ہو گیا ہے۔ اور خدا کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے۔ توبہ کرو اور انجیل کو قبول کرو"۔(لوقا ۱: ۱۵)۔

بظاہر کلمۃ اللہ نے وہی الفاظ دہرائے جو آپ کے پیشرو یوحنا کی زبان سے نکلے تھے ۔ کہ" خدا کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے"۔(متی ۳: ۲۔ لوقا ۱: ۱۵)۔ لیکن دونوں کے مفہوم میں فرق تھا۔ یوحنا اپنے آخری ایام تک وہ امر نہ سمجھ سکا ۔ جس کی تیاری اس نے اپنے جانشین کے لئے کی تھی۔اس نے قید خانے سے قاصد بھیجے تا کہ معلوم کرے کہ آیا مسیح موعود آگیا ہے اور"خدا کی بادشاہت" درحقیقت آگئی ہے اس کا خیال تھا کہ مسیح موعود عدالت کے لئے آئیگا۔ اور وہ درختوں کی جڑ پر کلہاڑا رکھیگا تا کہ " جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا اس کو وہ کاٹ کر آگ میں جھونک دے(متی ۳: ۱۰)" اس کا چھاج اس کے ہاتھ" میں ہوگا اور وہ "کھلیان کو خوب صاف " کرکے "بھوسی کو آگ میں جلائیگا جو بجھنے کی نہیں"۔ (لوقا ۳: ۱۷)۔ اس کا خیال تھا کہ جب مسیح موعود آئیگا تو آگ اس کے آگے آگے ہوگی اور خدا کا غضب اس کے پیچھے پیچھے ہوگا اور وہ غیر اقوام رومی سرداروں ، یہودی ریاکاروں اورہیرودیس جیسے بدکاروں کو ہلاک کرکے خدا کی بادشاہت قائم کریگا۔ جب خدا کا مسیح آیا تو وہ خدا کے غضب کی بجائے خدا کی لازوال محبت اور ابدی شفقت اور الہٰی مغفرت کا پیغام لے کر آیا۔ سیدنا مسیح نے یوحنا کے قاصدوں کو جواب دیا کہ خدا کی بادشاہت کے نشان اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کرلو(لوقا ۷: ۲۱تا ۲۲)۔ لیکن یہ نشان یوحنا یوحنا کے خیال کے مطابق نہ تھے ور نہ وہ اپنے شاگردوں کو قاصد بنا کر سیدنا مسیح کی خدمت میں نہ بھیجتا ۔ گو اس کے خیالات یہودی ربیوں کے سے نہ تھے ۔ تاہم وہ یہودیت کی زنجیروں سے آزاد نہ تھے(متی ۹: ۱۴تا ۱۷)۔اس نے " خداوند کی راہ تیار" کی تھی(مرقس ۱: ۳)وہ" دولہا کا دوست " تھا(یوحنا ۲: ۲۹) وہ " چمکتا ہوا چراغ " تھا (یوحنا ۵: ۳۵) اس نے خدا کی بادشاہت کی آمد کی بشارت دی تھی۔ لیکن سیدنا مسیح بشیر تھے وہ نذیر تھا وہ خود اس بادشاہت کی دہلیز پر ہی رہا ۔ سیدنا مسیح نے خود فرمایا" جو آسمان کی بادشاہت میں چھوٹا ہے

وہ یوحنا سے بڑا ہے"(متی ۱۱: ۱۱) کیونکہ خدا کی بادشاہت کی نسبت اس کا علم یوحنا کے علم سے بلند وارفع ہے۔

(۳)

سیدنا مسیح اور خدا کی بادشاہت:

کلمۃ اللہ نے اہلِ یہود پر ظاہر کردیا کہ خدا کی بادشاہت دنیاوی فتوحات کا نتیجہ نہیں ۔وہ قشونِ قاہرہ کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتی اور نہ وہ ممالک محروسہ پر مشتمل ہے۔ بلکہ اس بادشاہت کی کوئی حدود نہیں ہیں ۔کیونکہ وہ ایک خالص روحانی سلطنت ہے۔ جس کے قوانین عالمگیر ہیں اور جس میں ہر قوم طبقہ اورملت کے افراد شامل ہوسکتے ہیں۔ ع

کہ دریں راہ فلاں ، ابن فلاں چیزے نیست

یہ بادشاہ جورو، ظلم ، تعدی اور استبداد ، عقوبت وتعذیب اور جلال وقتال کی بنیاد پر قائم نہیں بلکہ محبت اورہمدردی ، رحم اور خدا ترسی ، حق اور عدل ، فروتنی اورانکساری ، خدمت اور صلیب برادری پر قائم ہے (یوحنا ۱۸: ۳۶۔ متی ۱۱: ۴۔ ۱۸: ۳۔ ۲۰: ۲۵تا ۲۸ وغیرہ)اس بادشاہت میں "جو بڑا ہونا چاہے" وہ سب کا خادم " بنے اورجو اول ہوناچاہے وہ سب کاغلام بنے"(مرقس ۱۰: ۴۴)۔

پس سیدنا مسیح نے حکومتِ الہیٰ کا ایک نیا اصول اس دنیا پر ظاہر کیا۔جیسا ہم ذکر کرچکے ہیں۔ اس اصول کی جھلک انبیاء اللہ کو ملی تھی ۔ جس کو انہوں نے اسیری کے زمانہ میں اپنے لوگوں پرظاہر کیا اور جس کو اہلِ یہود منجئی عالمین کے دنوں میں فراموش کرچکے تھے سیدنا مسح نے اس اصول کو اپنی تعلیم کا بنیادی پتھر قرار دے دیا۔ اور دنیا کی تاریخ میں ۔ مسیحیت نے پہلی دفعہ اس کوکامل طور پر ظاہر کرکے تمام عالم کی کایا پلٹ دی۔ آپ نے مسیح موعود اور آسمانی بادشاہت کے تصورات میں ایک نیا مفہوم ڈال دیا۔ جو پہلے ان میں موجود نہ تھا۔ گلیل کے یہوواہ اورآپ کے ہمعصروں کا یہ خیال تھا کہ جبر وتشدد کے ذریعہ مسیح اقوام عالم پر حکومت کریگا۔ لیکن جب مسیح موعود آئے تو وہ ہر قسم کے تشدد کے خلاف تھے۔ یہودی خیالات کے برعکس آپ نے حواریوں کو تعلیم دی کہ " شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ بلکہ جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیردے جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دوکوس چلا جا"(متی ۵: ۳۹تا ۴۱)۔اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اوراپنے ستانے والوں کے لئے دعا مانگو تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر بیٹے ٹھہرو۔ کیونکہ وہ اپنے سورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پرچمکاتا ہے اور راستبازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہ برساتاہے۔ چاہیے کہ تم کامل ہو جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے"(متی ۵: ۴۴تا ۴۸)۔آپ نے یہ تعلیم دی ہے کہ ہم ظلم کو ظلم سے مٹا نہیں سکتے بلکہ نیکی سے برائی کو مغلوب کرسکتے

ہیں۔شاگردوں کو حکم ہوا کہ مدافعت اورمقابلہ کی قدرت رکھتے ہوئے جوروجفا سہیں اور اگرچہ اظہار غیظ وغضب میں وہ قطعاً حق بجانب ہوں تاہم ان کو سرِ رشتہ صبر وسکون ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔ قدرتِ انتقام رکھتے ہوئے غصہ اور غضب کو مغلوب کریں۔آپ کا مقولہ تھا کہ " جو تلوار کھینچتے ہیں وہ تلوارسےہلاک کئے جائینگے "(متی ۲۶: ۵۲) آپ کا حکم ہے کہ ان جذبات سے کامل طور پر احتراز کیا جائے جن سے اشتعال انگیزی کا خفیف سے خفیف شائبہ بھی ہوسکتا ہو۔ایک دفعہ ایک گاؤں کے لوگوں نے آپ سے بدسلوکی کی۔ شاگردوں نے خفا ہوکر چاہا کہ " آسمان سے آگ برسے اور انہیں کھاجائے" منجی عالمین نے ان کو ڈانٹا اور فرمایا " تم نہیں جانتے کہ تم کس روح کے ہو کیونکہ ابن آدم انسانوں کی جانیں برباد کرنے نہیں بلکہ ان کو بچانے آیا ہے"(لوقا ۹ باب) ابن اللہ کے آخری ایام میں ایک شاگرد نے اپنے آقا ومولا کی حفاظت کی خاطر تلوار کھینچی توآپ نے منع کیا اور فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو فرشتوں کی بارہ فوجوں سے زیادہ میرے مخالفین کا استیصال کرنے کی خاطر حاضر ہوسکتی ہیں مگر میں تورضائے الہیٰ کو پورا کرنے آیا ہوں(متی ۲۶: ۵۱تا ۵۲)اور آپ نے زخمی سپاہی کو جو آپ کے خون کا پیاسا تھا شفا عطا کی (لوقا ۲۲: ۵۲) بلکہ آپ نے اپنے جانی دشمن کے حق میں جو آپ کو مصلوب کررہے تھے۔ دعائے خیر کی اورکہا" اے باپ ان کو معاف کرکیونکہ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کررہے ہیں"(لوقا ۲۳: ۳۴)۔ رومی گورنر نے سزائے تازیانہ وصلیب دیتے وقت آپ سے پوچھا "۔ کیا تو یہودیوں کا بادشاہ ہے" آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا" میری بادشاہت اس جہان کی نہیں"(یوحنا ۱۸: ۳۶) ایک دفعہ اہل یہود نے زبردستی بادشاہ بنانا چاہا توآپ نے انکار کردیا ۔ اوران کو ہکا بکا چھوڑ کرآپ وہا سے چلے گئے (یوحنا ۶: ۱۵) آپ نے لفظ" مسیح" کے تصور میں سے ہم قومی اور سیاسی عناصر کو خارج کردیا۔ آپ" دنیا پر غالب "آئے (یوحنا ۱۶ : ۳۳) اورہماری "نجات کے کپتان" بنے (عبرانیوں ۲: ۱۰) لیکن یہ فتح آپ نے تلوار کے زور سے یا آسمان سے آگ برسا کر حاصل نہ کی بلکہ آپ خدمت فرمانبرداری اور صلیبی موت کے ذریعہ " جلال کے بادشاہ" (زبور ۲۴: ۱۰)بنے۔

پس ثابت ہوگیا کہ منجئی عالمین کا یہ خیال نہیں تھا کہ آسمان کی بادشاہت کوئی دنیاوی سلطنت ہے جو تلوار کے زور سے وسیع ہوتی جائیگی۔ بلکہ آپ کا یہ خیال تھا کہ آپ بادشاہت روحانی بادشاہت ہے۔ جس کے اوپر خدا نے آپ کو حکمران کیا ہے۔ اہل یہود ایک جنگجو مسیح کے منتظر تھے جو ایک لشکر جرار لے کرروم کومغلوب کریگا۔اور اقوام عالم سے خراج وصول کریگا اور یروشلیم کے پھاٹکوں میں تختِ عدالت پر بیٹھ کر اسرائیل میں انصاف کریگا۔ لیکن یہ مسیح کہتا تھا کہ خدا کی بادشاہت نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے اس کا کوئی مرکزی مقام دارالسلطنت نہیں ہے(لوقا ۱۷: ۲۱)وہ قیصر روم کو خراج ادا کرنے میں کچھ ہرج نہیں سمجھتا تھا (مرقس ۱۲: ۱۳تا ۱۷)اہلِ یہود اس کے دعوئے مسیحائی

کو اپنے خیالات کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے تھے۔ (مرقس ۱۸: ۱۱) اور بار بار اس سے تقاضا کرتے کہ " توان کاموں کو کس اختیار سے کرتا ہے"؟(مرقس ۱۱: ۲۸)۔ کس نے تجھے یہ اختیار دیا ہے"؟(متی ۱۲: ۳۸) لیکن کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ " جو لوگ نشان طلب کرتے ہیں" وہ اس زمانہ کے بُرے لوگ ہیں۔(لوقا ۱۱: ۲۹) کیونکہ ان کے دلوں کو جنگجو مسیح کے تصور نے مغلوب کررکھا تھا۔ جب ایک شخص اس کے پاس درخواست لے کرآیا کہ اسرائیل میں انصاف کرے تو اس مسیح نے صاف انکار کردیا (لوقا ۱۲: ۱۳تا ۱۴)۔ یہ مسیح جنگجو بادشاہ بننے سے انکار کرنے پر اصرار کرتا تھا۔(یوحنا ۶: ۱۵) جب یہودی شاطروں کی چال کامیاب ہوگئی اورآپ پکڑے گئے تو انہوں نے رومی گورنر کے پاس شکایت کی یہ شخص نہایت خطرناک ہے لیکن درحقیقت ان کی یہ شکایت یہ تھی کہ کلمۃ اللہ خطرناک نہیں تھے پلاطس نے توصلیب کواوپر یہ کتبہ لکھا تھا کہ یہ یہودیوں کا بادشاہ ہے لیکن یہود نے آپ کو مصلوب کردیا تھا ۔ کیونکہ وہ ان کے مطلب کے موافق یہودیوں کا بادشاہ بننے سے انکاری[76] تھے۔

پس سیدنا مسیح کے خیالات آپ کے ہم عصروں کے خیالات سے بلند وبالا اور ارفع تھے یہود ایک محدود سلطنت چاہتے تھے ۔ کلمۃ اللہ ایک لامحدود سلطنت کی منادی کرتے تھے آپ ایک ایسی سلطنت کے سلطان تھے جو زمان ومکان کی قیود سے آزاد تھی جو الفاظ آپ نے اس سلطنت کے متعلق استعمال فرمائے وہ اس حقیقت کے موید ہیں(مرقس ۹: ۱۔ متی ۲۱: ۴۳۔ مرقس ۱۰: ۱۵۔ متی ۲۵: ۳۴۔ ۵: ۲۰۔ ۱۳: ۴۴تا ۴۶وغیرہ) اہل یہود کو بار بار آپ نے فرمایا کہ میری سلطنت اس دنیا کی نہیں ہے۔ لیکن آپ نے ہمیشہ اہل یہود پر اپنا روحانی اختیار جتلایا اوراپنے آپ کو بادشاہ کہا(متی ۲۱: ۲۳۔ ۲۵: ۳۴وغیرہ) زمانہ قدیم میں سلطان السلاطین نے ابراہام سے فرمایا تھا کہ " اپنے ملک اور قرابتیوں کے درمیان سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل چل اور میں تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کرونگا (پیدائش ۱۲: ۱) اوراب کنعان کی سرزمین میں ایک بااختیار سلطان نے ببانگ دہل اعلان فرمایا" اگر کوئی میرے پاس آئے اوراپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے تو میرا شاگرد نہیں ہوسکتا (لوقا ۱۴: ۲۶) کلمۃ اللہ سے عشق ومحبت سرمایہ حیات اور وثیقہ نجات ہے گو آپ "داؤد کے تخت" پر بیٹھنے سے انکار کرتے تھے تاہم آپ" عجیب مشیر خدائے قادر ابدیت کا باپ سلامتی کا شہزادہ "کہلانے کو تیار تھے جس کی سلطنت کے اقبال اور سلامتی کی کچھ انتہا نہ ہوگی"(یسعیاہ ۹: ۶) گو"آپ خدا کی بادشاہت " کی منادی کرتے تھے لیکن آپ نے کبھی خدا کو اس بادشاہت کا بادشاہ نہ کہا بلکہ آپ خود اس بادشاہت کے بادشاہ تھے۔ آپ نہ صرف اس بادشاہت کے بانی تھے ۔ بلکہ خود اس کے سلطان اورمالک تھے(متی ۱۳: ۴۱۔ ۱۶: ۲۸۔ ۲۰: ۲۱۔ ۲۵: ۳۴تا ۴۰)۔ یہ بادشاہ اہل یہود کے بادشاہوں

[76] Seeley, Ecce. Homo. Chap.3

کی مانند نہ تھا۔ جو خدا کے احکام اور مرضی پر نہیں چلتے تھے۔ بلکہ اس سلطان کو خدا کی رضا نہایت مرغوب تھی (متی ۱۱: ۲۷۔ یوحنا ۴: ۳۴۔ ۵: ۳۰۔ ۶: ۳۸وغیرہ)۔

انجیل نویس اس امر پر بڑا زور دیتے ہیں کہ سیدنا مسیح داؤد کی نسل سے تھے لہذا داؤد کے تخت کے وارث تھے(لوقا ۱: ۳۲۔ متی ۱: ۲۰ وغیرہ)لیکن سیدنا مسیح نے خود اپنے دعوےٰ کو نسب ناموں اور دنیاوی تعلقات پر مبنی نہ کیا۔ کیونکہ آپ بادشاہ کہلانے کا اپنے آباؤ اجداد سے بہتر اوراعلیٰ حق رکھتے تھے سیدنا مسیح اپنے آپ کو داؤد سے اعلیٰ اوراپنی بادشاہت کو یہودی ریاست سے افضل خیال کرتے تھے ۔ (مرقس ۱۲: ۳۵تا۳۷)آپ سلطنت الہیٰ کے بادشاہ ہیں۔ کیونکہ آپ حقیقی معنوں میں ظل اللہ ہیں۔ آپ خدا کے مظہر ہیں ۔ اور آپ کی شخصیت معرفت الہیٰ کا وسیلہ ہے۔(متی ۱۱: ۲۷۔ یوحنا ۱۴: ۶تا ۹) آپ عالمگیر روحانی سلطنت کے بادشاہ ہیں۔ آپ بیس صدیوں سے ہر ملک ،ملت، قوم اورطبقہ کے دلوں پر کلیسیا کے اندر اور باہر فرمانروا رہے اور تادوام رہینگے۔

ع اے تاجِ دولتِ برسرت ازابتداتا انتہا!

(۴)

منجئی عالمین کی صلیبی موت اور خدا کی بادشاہت

منجئی عالمین نے خدا کی بادشاہت کو اپنی صلیبی موت کے ساتھ متعلق فرمایا چونکہ یہ بادشاہت جوروظلم پر نہیں بلکہ ایذا سہنے پر مبنی تھی اور فروتنی صلیب برادری اورایثار نفسی اس کے اعلیٰ تریں قوانین تھے(متی ۱۰: ۳۸۔ مرقس ۱۰: ۳۴تا ۳۸)لہذا ضرور تھا کہ اس کا بادشاہ بھی حلیم اور فروتن (متی ۱۱: ۳۰) اور صلیب بردارہوتا(لوقا ۹: ۲۳) منجئی جہان کی وفات الہیٰ سلطنت کے قیام کے لئے ایک ضروری منزل تھی(لوقا ۲۲: ۱۵تا ۱۸) اس بادشاہت میں وہ تمام فروتن اورجانباز لوگ داخل ہونگے جو دوسروں کو اپنے سے افضل جان کر حقیر اور ادنیٰ لوگوں کو خدمت کرکے بھولی بھٹکی بھیڑوں کی تلاش کرکے ان میں داخل ہونے میں مدد دینگے۔

منجئی کونین کی صلیبی موت نے اس بادشاہت کا دروازہ تمام جہان کے گنہگاروں کے لئے کھول دیا۔(مرقس ۱۴: ۲۲تا ۲۵)آپ نے فرمایا کہ" ابن آدم اس لئے آیا ہے کہ اپنی جان بہتیروں کے بدلے فدیہ میں دے"(متی ۲۰: ۲۸) آپ کی موت او ربنی آدم کی نجات میں علت ومعلول کا رشتہ ہے آپ نے خدا کی بادشاہت کو حاصل کرنے کا جو طریقہ بتایا وہ دنیا جہان سے نرالا تھا اور تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ یہ طریقہ ملک اور ہر قوم اورہر طبقہ کے

گنہگاروں کی نجات کے لئے موثر اور کارگرثابت ہوا ہے۔ جس یونانی لفظ کا ترجمہ " فدیہ" کیا گیاہے۔ وہ یونانی زبان کے ترجمہ سبعینیہ(Septuagint) میں لفظ " غفر" کو ادا کرنے کےلئے استعمال کیا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ منجئی عالمین اپنی صلیبی موت کو الہیٰ مغفرت کا ذریعہ خیال فرماتے تھے ۔ پس کل اقوام عالم کے گنہگار اس ذریعہ سے اپنے گناہوں کی معافی حاصل کرکے خدا کی بادشاہت میں داخل ہوتے ہیں منجئی جہان نے صلیبی " موت کی تلخی" کے وسیلے آسمان کی بادشاہت سب مومنین پر کھول دی"۔

(۵)

خدا کی بادشاہت بہترین نصب العین ہے:

کلمتہ اللہ نے فرمایا کہ خدا کی بادشاہت کا قیام ہر شخص کا نصب العین ہوناچاہیے۔ اس کو ہرشے پر مقدم تصور کرنا چاہیے آپ نے فرمایا" تم پہلے خدا کی بادشاہت اوراس کی راستبازی کی تلاش کر"(متی ۷: ۳۳)۔

اس امر کو آپ نے دو تمثیلوں کے ذریعہ واضح کیا اور فرمایا" آسمان کی بادشاہی کھیت میں چھپے خزانہ کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے پا کرچھپادیا اور خوشی کے مارے جا کر جوکچھ اس کا تھا بیچ ڈالا اور اس کھیت کو مول لے لیا۔ پھر آسمان کی بادشاہی اس سوداگر کی مانند ہے جو عمدہ موتیوں کی تلاش میں تھا۔ جب اسے ایک بیش قیمت موتی ملا تو اس نے جا کر جو کچھ اس کا تھا سب بیچ ڈالا اور اسے مول لےلیا۔(متی ۱۳: ۴۵تا ۴۶)۔

کلمتہ اللہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی بادشاہت ایک ایسی بیش قیمت شے ہے کہ دنیا کی ہر چیز اس کے مقابل بے حقیقت اوربے مایہ ہے کہ چونکہ وہ مرغوب تریں اوراعلیٰ تریں مطمع ہے اس لئے کلمتہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ" تم پہلے خدا کی بادشاہت اوراس کی راستبازی کی تلاش کرو"(متی ۶: ۳۳)آپ کے ان الفاظ نے دنیائے اخلاق میں ایک نہایت عظیم الشان تبدیلی پیدا کردی جو اشیاء مثلاً دولت ، حشمت، جاہ وغیرہ پہلے قابل قدر خیال کی جاتی تھیں۔ وہ یکسرے بے مایہ اوربے وقعت ہو گئیں۔ والدین اور رشتہ داروں سے کورانہ محبت اوران کی اندھی پیروی۔ بزرگوں کی روایات کی عزت وتکریم۔ سوسائٹی کے مروجہ رسوم وقوانین ، دنیاوی حشمت ومرتبہ ۔ لوگوں میں ہر دل عزیز شمار ہونا۔ شکم پروری، نفس پرستی ، آرام وعیش کی زندگی دولت کی فراہمی وغیرہ وغیرہ یکسر بے قدر اوربے حقیقت ہو گئیں ۔ اور خدا کے احکام رضائے الہیٰ کی پیروی غربت وافلاس ۔ لعن طعن کی صبر سے برداشت ، ایثار نفسی ، خودانکاری ، سرفروشی ، خلقِ خدا کی خدمت وغیرہ اعلیٰ تریں بیش قیمت اور گراں مایہ امورقرار دئے گئے۔

دنیا دار اشخاص اس اعلیٰ تریں مطمع نظر کی پروا نہیں کرتے اور دینوی معاملات کو اس ازلی بادشاہت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ

اپنی کرتوتوں کی وجہ سے لاپروا اور غافل رہ کر اس بادشاہت سے محروم رہ جاتے ہیں اور اس واضح حقیقت کو منجئی عالمین نے ایک تمثیل کے ذریعہ سمجھایا اور فرمایا" کسی شخص نے ایک بڑی ضیافت کی اور بہت سے لوگوں کو مدعو کیا۔جب کھانے کا وقت ہوگیا تو اس نے اپنے نوکر کو بھیجا کہ بلائے ہوؤں سے کہو کہ آؤ سب کچھ تیار ہے ۔لیکن سب نے مل کر عذر کرنا شروع کردیا۔پہلے نے اس سے کہا میں نے کھیت مول لیا ہے اور میرا اسے دیکھنے کے لئے جانا ضروری ہے ۔میں تیری منت کرتا ہوں کہ مجھے معذور رکھ۔دوسرے نے کہا : میں نے پانچ جوڑی بیل خریدے ہیں اور میں بھی انہیں آزمانے جارہا ہوں میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ مجھے معذور رکھ۔ایک اور نے کہا : میں نے بیاہ کیا ہے اس لئے میرا آنا ممکن نہیں۔ تب نوکر نے واپس کر یہ ساری باتیں اپنے مالک کو بتائیں ۔گھر کے مالک کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے اپنے نوکر سے کہا : جلدی کرو اور شہر کے گلی کوچوں میں جاکر غریبوں ، ٹنڈوں، اندھوں اور لنگڑوں کو یہاں لے آؤ۔ نوکر نے کہا : اے مالک آپ کے کہنے کے مطابق عمل کیا گیا لیکن ابھی بھی جگہ خالی ہے ۔ مالک نے نوکر سے کہا : راستوں اور کھیتوں کی باڑوں کی طرف نکل جاؤ اور لوگوں کو مجبور کرو کہ وہ آئیں تاکہ میرا گھر بھر جائے ۔ کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ جو پہلے بلائے گئے تھے ان میں سے کوئی بھی میری ضیافت کا کھانا چکھنے نہ پائے گا۔(لوقا ۱۴ : ۱۶ تا ۲۴)۔

سیدنا مسیح کا یہ مطلب ہے کہ خدا دنیا کے ہر فردِ بشر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ آسمان کی بادشاہت کو اعلیٰ جان کر تمام باتوں پر ترجیح دے کر اس میں داخل ہونے کے لئے جدوجہد کریں لیکن جو شخص دیدہ دانستہ دینوی امور کو خدا کی بادشاہت پر فوقیت دیتا ہے اور خدا کی دعوت کو اور بہترین نصب العین کو رد کرکے ٹھکرادیتا ہے وہ اس عظیم الشان برکت سے اپنے آپ کو محروم کردیتا ہے اور خدا کی حضوری سے خود اپنے آپ کو خارج کردیتا ہے۔

(۶)

خدا کی بادشاہت کی حقیقت:

کلمۃ اللہ نے چند تمثیلوں کے ذریعہ خدا کی بادشاہت کے مفہوم کو اپنے شاگردوں پر ظاہر کیا۔آپ نے فرمایا کہ خدا کی بادشاہت کے روحانی اصول خودبخود رفتہ رفتہ لوگوں کے دلوں کو موہ لینگے اور وہ وسعت پاتی جائیگی اس صداقت کو ذہن نشین کرنے کے لئے آپ نے دو تمثیلیں اپنے شاگردوں کو سنائیں اور فرمایا کہ" آسمان کی بادشاہت اس خمیر کی مانند ہے جسے کسی عورت نے لے کر تین پیمانے آٹے میں ملادیا اور ہوتے ہوتے سب خمیر ہوگیا"(متی ۱۳ : ۳۳)اسی صداقت کو دوسری تمثیل میں آپ نے ایک اور پیرایہ میں ظاہر کیا اور فرمایا" آپ نے ان سے فرمایا پروردگار کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے۔ اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے اور وہ بیج اس

طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے۔زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے پہلے پتی ، پھر بالیں ، پھر بالوں میں تیار دانے ۔ پھر جب اناج پک چکا تووہ فی الفور درانتی لگاتا ہے کیونکہ کاٹنے کاوقت آپہنچا۔ (مرقس ۴: ۲۶تا ۲۹)۔

کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ گو خدا کی بادشاہت ابتدا میں ظاہر اطور پر بالکل حقیر اور چھوٹی شے نظر آتی ہے تاہم وہ اقصائے عالم تک پھیلتی جائیگی اور اقوام عالم اس میں شامل ہونگی۔ آپ نے فرمایا "آسمان کی بادشاہی " اس رائی کے دانے کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بودیا۔ وہ سب بیجوں میں سے چھوٹا توہے مگر جب بڑھتاہے توسب ترکاریوں سے بڑا اور ایسا درخت ہوجاتاہے کہ ہوا کہ پرندے آکر اس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں۔(متی ۱۳ : ۳۱تا ۳۲)۔

کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ جب اقوام عالم خدا کی بادشاہت میں شامل ہوجائینگی اور نیک وبد اس میں داخل ہونگے تو نیکوں کی خاطر بدوں کی بد کرداری کی برداشت کی جائیگی لیکن اگر وہ اپنی بدی پر اصرار کرینگے تو ان کاانجام اچھا نہیں ہوگا۔آپ نے اس حقیقت کو دو تمثیلوں کےذریعہ واضح کیا اور فرمایا کہ " آپ نے ایک اور تمثیل ان کے سامنے ارشاد فرمائی کہ "آسمان کی بادشاہی "اس آدمی کی مانند ہے جس نے اپنے کھیت میں اچھا بیج بویا۔ مگر لوگوں کے سوتے میں اس کا دشمن آیا اور گیہوں میں کڑوے دانے بھی بو گیا۔ پس جب پتیاں نکلیں اور بالیں آئیں تووہ کڑوے دانے بھی دکھائی دئیے ۔ نوکروں نے آکر گھر کے مالک سے کہا اے مولا کیا آپ نے اپنے کھیت میں اچھا بیج نہ بویا تھا ؟اس میں کڑوے دانے کہاں سے آگئے ؟اس نے ان سے کہا یہ کسی دشمن کا کام ہے ۔ نوکروں نے اس سے کہا کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم جا کر ان کو جمع کریں؟اس نے کہا نہیں ایسا نہ ہو کہ کڑوے دانے جمع کرنے میں تم ان کے ساتھ گیہوں بھی اکھاڑ لو۔ کٹائی تک دونوں کو اکٹھا بڑھنے دو اور کٹائی کے وقت میں کاٹنے والوں سے کہہ دوں گا کہ پہلے کڑوے دانے جمع کرلو اور جلانے کے لئے ان کے گٹھے باندھ لو اور گیہوں میرے کھتے میں جمع کردو۔(متی ۱۳ : ۲۴تا ۳۰)۔کلمۃ اللہ نے خلوت میں شاگردوں کو اس تمثیل کا مطلب اپنی زبانِ حقائق ترجمان سے یوں سمجھایا کہ " اچھے بیج کا بونے والاابن آدم (یعنی سیدنا عیسیٰ) ہے۔ اور کھیت دنیاہے اور اچھا بیج بادشاہی کے فرزند اور کڑوے دانے اس شریر مردود کے فرزند ہیں۔ جس دشمن نے ان کو بویا وہ ابلیس ہے اور کٹائی دنیا کاآخر ہے اور کاٹنے والے فرشتے ہیں۔ پس جیسے کڑوے دانے جمع کئے جاتے اور آگ میں جلائے جاتے ہیں ویسے ہی دنیا کے آخر میں ہوگا۔ ابن آدم اپنے فرشتوں کو بھیجے گا اور وہ سب ٹھوکر کھلانے والی چیزوں اور بدکاروں کو اس کی بادشاہی میں سے جمع کریں گے ۔ اور ان کو آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے ۔ وہاں رونا اور دانت پیسنا ہوگا۔ اس وقت دیانتدار اپنے پروردگار کی بادشاہی میں آفتاب کی مانند چمکیں گے ۔ جس کے کان ہوں وہ سن لے ۔(متی ۱۳ : ۳۷تا ۴۳)۔

سیدنا مسیح نے ایک اور تمثیل سے اسی صداقت کو واضح کیا اور فرمایا کہ " آسمان کی بادشاہی اس بڑے جال کی مانند ہے جو دریا میں ڈالا گیا اور اس نے ہر قسم کی مچھلیاں سمیٹ لیں۔ اور جب بھر گیا تو اسے کنارے پر کھینچ لائے اور بیٹھ کر اچھی اچھی تو برتنوں میں جمع کرلیں اور جو خراب تھیں پھینک دیں۔ دنیا کے آخر میں ایسا ہی ہوگا ۔ فرشتے نکلیں گے اور بد یانتوں کو دیانتداروں سے جدا کریں گے اور ان کو آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے وہاں رونا اور دانت پیسنا ہوگا۔(متی ۱۳ : ۴۷تا ۴۹)۔

پس سیدنا مسیح نے یہ تعلیم دی ہے کہ خدا کی بادشاہت کی جڑ انسان کے دل میں کلام اللہ اور حق اور روح کے ذریعہ قائم ہوتی ہے(متی ۱۳ : ۱۹ - یوحنا ۱۸ : ۳۷- ۳: ۵، ۶) اورانسانی طبیعت کو کلیتہً تبدیل کردیتی ہے(متی ۱۸:۳)جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتاہے کہ بنی نوع انسان خدا کی مرضی پرچلنا شروع کردیتے ہیں۔(متی ۷: ۲۱)۔

پس یہ بادشاہت غیر مرئی، باطنی اور زندگی بخش ہے(لوقا ۱۷ : ۲۱) وہ انسان کو خدا کی قربت اوررفاقت عطا کرتی ہے۔ اور اس باطن میں ایک "نیادل" اور مستقیم روح"(زبور ۵۱: ۱۰) پیدا کردیتی ہے اوراس کی اخلاقی زندگی ازسر نونشوونما پانے لگ جاتی ہے ۔ یہ بادشاہت ترقی کرتی جاتی ہے اور تمام اقوام عالم میں پھیل جاتی ہے یہاں تک کہ ایک "نیاآسمان" اور نئی زمین خلق ہوجاتے ہیں اور اس دنیا کے ہر شعبہ پر ایسا زبردست اثر پڑتا ہے کہ اسکی کایاپلٹ جاتی ہے۔

(۷)

خدا کی بادشاہت کی آمد:

چونکہ خدا کی بادشاہت ظاہری شے نہیں بلکہ باطنی اور اندرونی ہے۔(لوقا ۱۷ : ۲۰) لہذا وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو عالمِ وجود کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ چنانچہ فریسیوں نے ایک دفعہ کلمتہ اللہ سے استفسار کیا کہ خدا کی بادشاہت کب آئیگی۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ خدا کی بادشاہت تمہارے اندر موجود ہے(لوقا ۱۷ : ۲۰تا ۲۱)۔ آپ نےایک تمثیل کہی اور فرمایا کہ خدا کی بادشاہت خمیر کی مانند ہے جو سب آٹے کو خمیر کردیتاہے (متی ۱۳ : ۳۳)پس آسمانی بادشاہت ایک اصول ہے جو باطنی طور پر ہر فرد بشر کے دل میں تاثیر پیدا کرتاہے۔ منجئی جہان کی خدمت اورآپ کے اقوال وافعال نے دنیا کی شیطانی حکومت پر دھاوا بول دیاہے اورایک نیا دوراس دنیا پر شروع ہوگیاہے" خدا کی بادشاہت تمہارے پاس آپہنچی"(لوقا ۱۱ : ۲۰) اس بادشاہت کے پھاٹک کھل گئے ہیں اور جو انسان شیطان پر حملہ آور ہوتے ہیں وہ اس میں داخل جاتے ہیں ۔(متی ۱۱ : ۲۰)سیدنا مسیح کے پیش رو یوحنا زمانہ تک شریعت حکمران تھی اس وقت خدا کی بادشاہت کی خوشخبری دی جاتی ہے

جس میں ہر ایک جوشیلا شخص شیطان سے جنگ کرکے داخل ہوتاہے (لوقا ۱۶: ۱۶)یہاں تک کہ تائب محصول لینے والے اور رجوع لانے والی کسبیاں گناہوں کی مغفرت حاصل کرکے خدا کی بادشاہت میں فریسیوں سے پہلے داخل ہوتی ہیں(متی ۲۱: ۳۱)۔

پس ظاہر ہے کہ سیدنا مسیح کے لئے خدا کی بادشاہت ایک موجودہ حقیقت تھی جوآپ کی منادی اور ذاتِ الہٰی کے نئے مکاشفہ کی وجہ سے ظہور میں آئی تھی۔ آپ کا یہ خیال تھا کہ یہ بادشاہت چند افراد سے شروع ہوکر خمیر کی طرح زمانہ مستقبل میں اقصائے عالم میں پھیل جائیگی۔ آپ کا یہ خیال نہیں تھا۔ کہ یہ بادشاہت یک لخت اعجازی طورپر محض خدا کی قدرت کے ذریعہ عالم وجودمیں آجائیگی ۔ یہ یہودی ربیوں کا خیال تھا لیکن کلمۃ اللہ کا یہ خیال تھا کہ انجیل جلیل کے محبت آمیز پیغام کے ذریعہ اورآپ کی بے نظیر شخصیت اورلاثانی مکاشفہ کے ذریعہ خدا کی بادشاہت کی حدود ہمیشہ بڑھتی جائینگی یہاں تک کہ کل اقوامِ عالم اس سلطنت میں شریک ہوجائینگی۔ اورخدا کی مرضی " جس طرح آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہوگی"۔ یہودی ربیوں کا قول تھا کہ یہ بادشاہت بغیر انسانی کوشش کے قائم ہوگی۔ لیکن کلمۃ اللہ کو یہ احساس تھاکہ اس مقصد کی تکمیل میں آپ کو اورآپ کے حواریوں کو سر توڑ کوشش کرنی پڑیگی ۔ یہاں تک کہ آپ کو صلیبی موت کی برداشت کرنی پڑیگی اورآپ کے شاگردوں کو ہر طرح کی ایذا اور مصیبت سے جان جوکھوں کا مقابلہ کرنا پڑیگا۔آپ کا یہ ایمان تھا۔ کہ یسعیاہ نبی باب ۵۳ کی پیشین گوئی کا اطلاق صرف آپ پر ہی ہوتا ہے اورآپ خداوند کے وہ خادم اور رسول ہیں جو"اندھوں کی آنکھیں کھولیگا۔ اور بندھوؤں کو قید سے نکالیگا۔ اوران کوجو اندھیرے میں بیٹھے ہیں قید خانہ سے چھڑائیگا۔(یسعیاہ ۴۲: ۷) اور" جس کے وسیلے خدا کی مرضی برآئیگی"۔ جو اپنی معرفت کے وسیلہ بہتوں کو راستباز ٹھہرائیگا "(یسعیاہ ۵۳: ۱۰ تا ۱۱)۔ منجئی کونین نے اپنے مکاشفہ کے وسیلے خدا کی بادشاہت کو تمام دنیا پر ظاہر کیا اور یہ تعلیم دی کہ راست بازی اورمحبت کےذریعہ ہر ملت، قوم اور طبقہ کا شخص اس بادشاہت میں شریک ہوسکتاہے۔آپ کی اخلاقی تعلیم اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ آپ کا یہ خیال نہ تھا کہ یہ بادشاہت ایک لحظ میں محض الہٰی دستِ قدرت سے ظہور پذیر ہوگی۔ بلکہ آپ کا یہ خیال تھاکہ اخلاقی جدوجہد کے ذریعہ شیطانی امور کا مقابلہ کرنے سے یہ بادشاہت روئے زمین پر قائم ہوگی اور اکنافِ عالم تک وسعت پائیگی تاحدیکہ کل بنی نوع سعید بن کراس میں داخل ہوجائینگے۔

(۸)

سیدنا مسیح کی آمد ثانی:

انجیل شریف میں ہمیں چند فقرات ایسے بھی ملتے ہیں ۔جن سے یہ مترشح ہوتاہے ۔ کہ سیدنا مسیح کا یہ خیال تھاکہ الہٰی سلطنت جلدی ظہور پذیر

ہو گی۔(مرقس باب ۱۳ ۔ متی ۲۴ باب)ان ابواب اور فقرات کی بنا پر بعض نقاد بالخصوص البرٹ شوئیٹزر(Albert Schweitzer)کہتےہیں کہ سیدنا مسیح جب اس دنیا میں تھے تو وہ اپنے آپ کو مسیح موعود تصور نہیں کرتے تھے بلکہ آپ کا خیال تھا کہ آپ تب مسیح ہونگے جب آپ آمدِ ثانی کے وقت جلال کے ساتھ واپس آئینگے اورآپ کی وفات کے بعد ہی خدا خوارقِ عادت طورپر آپ کی حمایت کریگا اورآپ مسیح ہو کر آسمان سے واپس آئینگے اوراس دنیا کو تباہ کرکے ایک نئی دنیا قائم کرینگے۔ پس آپ در حقیقت اخلاقیات کے استاد نہ تھے۔کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ آپ کی آمدِ ثانی چند دنوں میں ہی وقوع پذیر ہو گی اورخدا کی سلطنت یک لخت الہیٰ دستِ قدرت کے وسیلے قائم ہوجائیگی ۔پس آپ کے اخلاقی اصول محض اس تھوڑی مدت کے وقفہ کے لئے وضع ہوئے تھے کیونکہ آپ کے خیال میں آپ کی آمد ثانی نہایت قریب تھی۔آپ کا حقیقی منشا یہ تھا کہ اپنے حوارئین کو آمدِ ثانی کے اعجازی واقعہ کے لئے تیار کریں۔تاکہ اس اثنا میں وہ تمام دنیاوی تعلقات کو قطع کرسکیں[77] ۔

لیکن جب ہم مذکورہ بالاابواب کا غور سے مطالعہ کرتےہیں تو ان انتہا پسند نقادوں کی رائے کی خامی ہم پرظاہر ہوجاتی ہے۔اس میں کچھ شک نہیں کہ اناجیل میں چند فقرات ایسے موجودہیں ۔جن سے یہ نتیجہ اخذ ہوسکتاہے کہ سیدنا

[77]Schweitzer's Quest of the Historical Jesus. (1910).Trans,by W.Montgomery, See also sanday life of Christ in Recent Research.

مسیح کے خیال میں آپ کی آمدِ ثانی بعید نہیں تھی۔بلکہ قریب زمانہ میں واقع ہونے والی تھی ۔ لیکن اس بنیاد پر ان نقادوں نے ایک عظیم الشان نظریہ کھڑا کردیاہے کہ بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

انجیل کے تواریخی مطالعہ سے خدا کی بادشاہت کی آمد کے متعلق ذیل کے امور پر ہم ظاہر ہوجاتےہیں۔

(۱)جیسا ہم سطورِ بالامیں ثابت کرآئے ہیں سیدنا مسیح کا خیال تھا کہ الہیٰ بادشاہت آپ کی حینِ حیات میں ہی قائم ہو گئی ہے اوروہ ہمیشہ وسیع ہوتی جائیگی(متی ۱۱: ۱۱۔مرقس ۴: ۲۶تا ۲۹)۔

(۲۔) یہ سلطنت یک لخت اعجازی طورپر قائم نہیں ہو گی بلکہ خمیر کی طرح پھیلتی جائیگی۔جس کی اشاعت کے لئے منجی عالمین نے اپنے شاگردوں کو حکم دیا تھا۔(متی ۱۳: ۳۱تا۳۳)۔

(۳۔)چونکہ قوم یہود نے خدا کی محبت کی پروا نہیں کی بلکہ اس کے پیغام کو ٹھکرادیا لہذا اس پر سزا کا حکم زمانہ قریب میں ہوگا(متی ۲۳: ۳۸)۔

(۴۔) آپ نے فرمایا کہ دنیا کا موجودہ دور ختم کردیا جائیگا اورایک نیا دور شروع ہوگا۔ جس میں الہیٰ رضا سب پر حاوی ہو گی لیکن جب شاگردوں نے پوچھا کہ " یہ باتیں کب ہونگی اور تیری حضوری اورزمانے کی تکمیل کا نشان کیا

ہوگا"(متی ۲۴: ۳) آپ نے جواب میں فرمایا کہ" اس دن اوراس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا، نہ بیٹاصرف باپ"(متی ۲۴: ۳۶)۔

اگرانجیل شریف کاغور سے مطالعہ کیاجائے تو یہ معلوم ہوتاہے کہ اس آخری امر میں اناجیل کی آواز متفقہ نہیں ہے اور نہ صرف ان کے الفاظ یکساں نہیں بلکہ ان کے لہجہ میں بھی فرق دکھائی دیتا ہے جس سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتاہے کہ اس امر کا امکان ہے کہ حواریوں اورانجیل نویسوں نے سیدنا مسیح کے کلماتِ طیبات کے اپنے خیالات کے مطابق سمجھنے کی کوشش کرکے آپ کے مبارک الفاظ کو بغیر جانے بوجھے بے خبری سے یہودی خیالات کے رنگ میں رنگ دیا۔ چونکہ سیدنا مسیح کے بہت سے ایسے کلمات تھے جن کو سمجھنے سے حواری قاصر رہتے تھے (متی ۱۵: ۱۷۔ ۱۶: ۹تا ۱۱۔ مرقس ۸: ۱۷تا ۲۱ وغیرہ) یہ اغلب ہے کہ سیدنا مسیح کی آمد ثانی اورالہیٰ سلطنت کے قیام ووسعت کے لطیف اشارات اور کنایہ کووہ سمجھنے سے قاصر رہے ہوں اورآپ کے خیالات کویہودی ربیوں کے خیالات کے مطابق سمجھ لیاہو جن کا یہ خیال تھا کہ مسیح کی بادشاہت کو خداایک لخت قائم کریگاہم جانتے ہیں کہ آمد ثانی کے متعلق انجیل نویسوں نے اپنی سمجھ کے مطابق چند امور کو اس طرح سمجھاجس طرح سیدنا مسیح نے نہیں فرمایا تھا" مثلاً انجیل متی میں " اول اورآخر" کی تعلیم آمد ثانی کے متعلق کردی گئی ہے (۱۹: ۳۰) حالانکہ دراصل اس کا تعلق آمدِ ثانی کے ساتھ نہیں بلکہ موجودہ زندگی کے چال چلن کےساتھ تھا۔(مرقس ۹: ۳۵۔ ۱۰: ۳۱۔ لوقا ۲۲: ۲۶)اسی طرح انجیل لوقا میں بے انصاف قاضی کی تمثیل آمدِ ثانی کے متعلق کردی گئی ہے (۱۸: ۷، ۸) حالانکہ اسکا اصلی تعلق "ہروقت دعا مانگنے اورہمت نہ ہارنے" کے ساتھ ہے(۱۸: ۱) انجیل چہارم میں آمدِ ثانی کے متعلق سیدنا مسیح کا ایک قول درج ہے جس کا مطلب شاگردوں نے غلط سمجھا (یوحنا ۲۱: ۲۲تا ۲۳) پولوس رسول کے خط (۲ تھسلنیکیوں ۲ باب) سے بھی معلوم کرسکتے ہیں کہ سیدنا مسیح کی آمدِ ثانی کے خیالات کو یہودی تصورات کس قدر متاثر کررہے تھے۔

پس نہایت اغلب ہے کہ شاگرد اس تعلیم کو جو کلمۃ اللہ نے آمد ثانی کے متعلق دی تھی نہ سمجھے ہوں اوراپنے ہمعصروں کے خیالات کے مطابق آپ کے الفاظ کو سمجھ کر ان خیالات کو انجیل میں جگہ دے دی ہو۔ یہ نتیجہ اور بھی مضبوط ہو جاتاہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ سرجے۔ سی۔ہاکنس (Sir.J.C.Hawkins) جیسا محتاط نقاد اس امر کو قبول کرنے کو تیار ہے کہ مرقس باب ۱۳آیات ۷، ۱۴تا ۲۰، ۲۴تا ۲۷، ۳۰ الخ میں کسی یہودی مکاشفہ کا حصہ موجودہے۔انگریزعالم۔آر۔ایچ ۔چارلس (R.H.Charles) بھی اس خیال کا حامی ہے[78]۔ ممکن ہے کہ یہ نظر یہ درست نہ ہوتاہم یہ یقینی امر ہے کہ یہ فقرات سیدنا مسیح کے خیالات کے عکس نہیں بلکہ حواریوں کے خیالات کے عکس ہیں۔

---

78 Charles, Eschatology, 2nd ed.pp323-329

اس بات کے متعلق ایک اور امر قابل غور ہے۔ اس رسالہ کے مقدمہ میں ہم نے تنقید نتائج بیان کئے تھے اور یہ ذکر کیا تھا کہ انجیل کا ایک حصہ ہے جس کو ہم نے حرف تہجی "ک" سے موسوم کیا تھا ۔جو کلمۃ اللہ کے کلمات طیبات پر مشتمل ہے اور جو غالباً آپ کی حین حیات میں لکھا گیا تھا اس حصہ "ک" میں یہ آیات جن میں آمدِ ثانی کا زمانہ قریب میں ذکر ہے بالکل نہیں پائی جاتیں چنانچہ ڈاکٹر ریشڈال مرحوم (Rashdall) کہتاہے کہ " یہ یقینی امر ہے کہ ان آیات میں سے ایک آیت بھی ک میں نہیں پائی جاتی[79] ۔ پس یہ گمان یقین کادرجہ حاصل کرلیتا ہے کہ یہ آیات کلمۃ اللہ کے خیالات کاظاہر نہیں کرتیں بلکہ حواریوں کے خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔

اس نتیجہ کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ یہ نتیجہ ابن اللہ کے اقوال وافعال کے مطابق ہے اگر سیدنا مسیح نے یہ فی الحقیقت فرمایا تھا کہ " میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو یہاں کھڑے ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ جب تک ابن آدم کو اس کی بادشاہت میں آتے ہوئے نہ دیکھ لے موت کا مزہ ہر گز نہ چکھینگے "(متی ١٦ : ٢٨) اور وقائع نگار نے ابن اللہ کے مفہوم کو صحیح طورپر ادا کیاہے توآپ کی لاثانی تعلیم اور زریں اصول بے معنی ہوجائینگے اگر آپ نے درحقیقت شاگردوں سے فرمایا تھا کہ " میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم اسرائیل کے سب شہروں میں پھر چکوگے کہ ابن آدم آجائیگا "(متی ١٠ : ٢٣) توآپ کا شاگردوں کو یہ فرمانا اور حکم دینا بے معنی ہوگا کہ " تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور انہیں باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام پر بپتسمہ دو۔ اور انہیں یہ تعلیم دو کہ ان سب باتوں پر عمل کریں جن کا میں نے تم کو حکم دیا ہے اوردیکھو میں دنیا کے آخر تک ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں "(متی ٢٨: ١٩ تا ٢٠)۔ علاوہ زریں ایسے اقوال کلمۃ اللہ کی تمثیلوں اورآپ کے روحانی اصول کے نقیض ہیں۔ جن سے یہ معلوم ہوتاہے کہ خدا کی بادشاہت ایک روحانی اور باطنی حقیقت ہے جورفتہ رفتہ دنیا کو متاثر کرکے وسعت پکڑتی جائیگی۔ کلمۃ اللہ کے عالمگیر اصول بے معنی ثابت ہونگے اگر وہ صرف چند ماہ کے وقفہ کے لئے وضع کئے گئے تھے اور انتہا پسند نقاد راستی کی جانب ہونگے جو کہتے ہیں کہ آپ درحقیقت اخلاقیات کے استاد نہ تھے۔

لیکن ہم اس بات سے گریز نہیں کرسکتے کہ ممکن ہے کہ سیدنا مسیح نے اپنی خدمت کے دوران میں بعض دفعہ یہ خیال کیاہو کہ الہیٰ سلطنت کے قیام اور وسعت کے لئے کروڑہا سال کی مدتِ مدید کی ضرورت نہیں ہوگی ۔بہت اغلب ہے کہ آپ کی خدمت میں بعض اوقات ایسے امید افزا حالات پیدا ہوگئے ہوں کہ آپ کے دل میں یہ خیال آیاہو کہ خدا کی بادشاہت جلدی پھیل جائیگی۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک دفعہ جب ستر شاگرد منادی کرکے واپس سیدنا مسیح کے پاس آئے توحالات ایسے امید افزاد اورحوصلہ دہ تھے کہ آپ نے فرمایا " میں شیطان کو بجلی کی طرح آسمان سے گرا ہوا دیکھ رہا تھا "(لوقا ١٠ : ١٧ تا ٢٤)۔ لیکن

[79] Rashdall, Conscience and Christ.p.44

خدمت کے آخر میں صورتِ حالات دگرگوں ہو گئی۔حوصلہ شکن حالات نے پہلے خیالات کو منجی عالمین کے دل سے نکال دیا اورآپ نے یہ محسوس کرلیا کہ انجیل کی خوشخبری رفتہ رفتہ اس دنیا کو متاثر کرکے خدا کی بادشاہت کو پھیلائیگی۔

ہم نے اپنے ملک ہند کے حالات سے ایک مثال لے کر اس امر کو واضح کرسکتے ہیں۔ ۱۹۲۱ءمیں ترک موالات کے دنوں میں ہندوستان کے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے اختلاط کرنے لگ گئے تھے اورایسا معلوم ہوتا تھا کہ اندریں حالات سوراجیہ دور نہیں - مہاتما گاندھی نے کہا ہندوستان کو ایک سال کے اندر اندر سوراج مل جائیگا۔ لیکن مابعد کے واقعات نے اس خیال کو مہاتما جی کے دل سے نکال دیا۔ اوران کا حوصلہ ایسا پست ہوگیا کہ وہ سیاسی امور کو چھوڑ چھاڑ کئی سالوں تک الگ ہوگئے تھے اور وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ عوام الناس کےدلوں میں رفتہ رفتہ سوراجیہ کا خیال پیدا ہوئے بغیر سوراج ملنا محال ہے۔

پس ممکن ہے کہ جب سیدنا مسیح نے شہروں کے شہر، گاؤں کے گاؤں اورجم غفیر کو بخوشی خاطر اپنی تعلیم سنتے دیکھا توآپ کے دل میں یہ خیال آیاہو کہ اگرچندے ایسے ہی امید افزا حالات جاری رہے توخدا کی بادشاہت جلدی قائم ہوجائیگی لیکن مابعد کے مایوس کنُ اورحوصلہ شکن حالات نے سیدنا مسیح کے خیالات کو تبدیل کردیا ہو اورآپ اس نتیجہ پر پہنچے ہوں کہ خدا کی بادشاہت پھیلیگی ضرور لیکن رفتہ رفتہ یہاں تک کہ تمام دنیا میں خدا کی بادشاہت قائم ہوجائے گی اورابد الاآباد رہیگی۔

(۹)

ابدی زندگی اور بقا:

اس حیات مستعار کے بعد کوئی زندگی کے متعلق ڈاکٹر سامنڈ(Salmond) کے الفاظ ہم کوملحوظ خاطر رکھنے چاہئیں یہ لائق مصنف کہتاہے کہ " اناجیل میں سیدنا مسیح کے کل اقوال مندرج نہیں اور نہ آپ کی تعلیم ترتیب وار مختلف مضامین کے عنوان سے سلسلہ وار تحریر کی گئی ہے۔ان اقوال سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ سیدنا مسیح کا مقصد یہ تھا کہ آخری امور یا حیات بعدازممات کے مسئلہ پر مبسوط اور مفصل بحث کریں ۔ آپ کے الفاظ معنی خیز تھے لیکن اناجیل یہ دعویٰ نہیں کرتیں کہ آپ کا مدعا یہ تھا کہ آخری امور اورحیات بعدازممات کی نسبت کامل مکاشفہ عطا فرمائیں[80]۔

پس ان آخری امور اورحیات بعد ازممات وغیرہ کے مسائل سیدنا مسیح کی تعلیم کی روشنی میں ہی حل ہوسکتے ہیں کیونکہ کلمتہ اللہ نے ان مسائل پر اپنی زبان معجز بیان سے مفصل بحث نہیں کی۔ لیکن آپ کی خوشخبری نے زندگی اور بقاکے مسئلوں کو روشن کردیاہے۔(تمطاؤس ۱: ۱۰)۔

ایسا معلوم ہوتاہے کہ کلمتہ اللہ نے اس سلسلہ میں بعض الفاظ اپنی زبان مبارک سے نکالے تھے تاکہ اہلِ یہود آپ کے خیالات کو جو آپ ہمیشہ کی زندگی

[80] Salmond, Christian Doctrine of Immortality p.229.

کی نسبت رکھتے تھے سمجھ سکیں [81]۔ سیدنا مسیح نے یہ تعلیم دی ہے کہ جو لوگ خدا کی بادشاہت میں داخل ہوتے ہیں ۔ وہ ہمیشہ کی زندگی پاتے ہیں جو اسی دنیا میں شروع ہوجاتی ہے ۔ جب آپ نے فرمایا کہ " خدا کی بادشاہت تمہارے اندر ہے"(لوقا ۱۷: ۲۱) توآپ نے عبرانی انبیاء او ریہودی ربیوں اور اپنے ہم عصروں کے خیالات کو بہت پیچھے چھوڑدیا۔ آپ نے فرمایا کہ " خدا پر ایمان لانے اوراعمال صالح کرنے سے ہی انسان خدا کی بادشاہت میں جو ایک موجودہ حقیقت ہے داخل ہوسکتا ہے۔ (لوقا ۶: ۴۶) ہمیشہ کی زندگی میں جو اب دنیا میں موجود ہے وہ شخص داخل نہیں ہوتا جو اپنی زبان سے عقیدہ کے چند الفاظ نکالتا ہے ۔" جو مجھ کو اے مولا اے مولا کہتے ہیں ان میں سے ہر ایک آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگا"(متی ۷: ۲۱) بلکہ ہمیشہ کی زندگی میں وہ داخل ہوتاہے جو توبہ کرکے از سر نو خدا کی طرف رجوع کرتا اوراپنی زندگی روحانی اصول کے مطابق بسر کرتاہے(یوحنا ۳: ۵)مقدس پولوس رسول کے الفاظ میں روحانیت ہی زندگی اوراطمینان ہے"(رومیوں ۸: ۶) یہ ہمیشہ کی زندگی اسی دنیا میں ایک موجود ہ حقیقت ہے جس کا زمانہ اور وقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہے۔ ابدیت سے وقت کا کوئی علاقہ نہیں۔ ابدیت کا مطلب متعدد یا لامحدود سالوں یا صدیوں سے نہیں ہے بلکہ لفظ"

[81] Shatler Mathews in Hasting's One Vol.1. Bible Dictionary p.236.

ابدی " صفت ہے اور لفظ" زندگی" موصوف ہے۔ زندگی اور موت اخلاقی حالتوں کا نام ہے زندگی ایک نئی روحانی حالت ہے جس سے مراد وہ رفاقت ہے جو ابن اللہ کے ذریعہ ہم کو خدا کے ساتھ حاصل ہوتی ہے اور ابدی زندگی سے مراد اس روحانی رفاقت کی کاملیت ہے[82]۔ یہ زندگی لازوال اور لاتبدیل ہے۔ خدا نے اپنے ابن کے ذریعہ ہم کو ایسی زندگی کا مژدہ نہیں دیا جو صدیوں تک قائم رہیگی۔ بلکہ ہم کو یہ مکاشفہ ملا ہے کہ ابدی زندگی باپ کے ساتھ رفاقت رکھنے سے اسی فانی زندگی میں حاصل ہوتی ہے زندگی اور قیامت کا یہ مفہوم انجیل چہارم میں تقریباً ہر صفحہ پر ملتاہے ۔ کلمۃ اللہ نے فرمایا ۔" میں اس لئے آیا ہوں کہ وہ زندگی پائیں اور کثرت سے پائیں "(یوحنا ۱۰: ۱۰) " جو میرا کلام سنتا اور میرے بھیجنے والے کا یقین کرتاہے اس نے ہمیشہ کی زندگی حاصل کرلی ہے "(یوحنا ۵: ۲۴) "ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور عیسیٰ مسیح کو جسے تونے بھیجا ہے جانیں"(یوحنا ۱۷: ۳) آپ نے فرمایا " قیامت اور زندگی میں ہوں جو مجھ پر ایمان لاتاہے گووہ مرجائے توبھی زندہ رہیگا اورجو کوئی زندہ ہے اور مجھ پر ایمان لاتاہے وہ ابد تک کبھی نہ مریگا"(یوحنا ۱۱: ۲۵تا ۲۶)۔

[82] Solmand Op.Cit.p.391

(۱۰)

خدا کی بادشاہت کے قوانین

حضرت موسیٰ کو خدا نے ایک پہاڑ کوہ سینا پر شریعت عطا کی۔ لہذا یہ موزوں تھا کہ سرورِ انبیاء (لوقا ۱۱: ۳۲) جس کی بادشاہت کا ادنیٰ ترین ممبر خاتم الانبیاء حضرت یوحنا (متی ۱۱: ۱۳) سے بھی بڑا ہے (متی ۱۱: ۱۱) ایک پہاڑ پر سے اپنی بادشاہت کے قوانین صادر فرماتے ہیں۔ یہ قوانین انجیل اول میں ایک جگہ جمع کئے گئے ہیں (باب پنجم تا باب ہفتم) اور عموماً "پہاڑی وعظ" کے نام سے موسوم ہیں۔ موسوی شریعت خوف اور دہشت سے شروع ہوئی تھی جس سے بدن پر لرزہ پڑجاتا تھا لیکن یہ قوانین برکاتِ خداوندی سے شروع ہوتے ہیں۔ تمام دنیا کی لٹریچر میں ایسے چھوٹے ۔مطلب خیز۔ لاثانی جملے اور مقولے جیسے کلمۃ اللہ کی زبان معجز بیان سے صادر ہوئے ہیں ملنے محال ہیں جس طرح آپ کے کلماتِ طیبات بے نظیر ہیں اسی طرح آپ کے خیالات بھی نرالے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں جو غمگین اور حلیم ہیں۔ سامعین جو یونانی رومی دنیا کی مادی ترقی اور جاہ وجلال کے پاؤں تلے روونے جانے کے عادی تھے ان مبارک الفاظ کو سن کر چونک پڑے ہونگے ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو غریب اور مسکین تھے جن کے دلوں کے آنسوؤں نے پژمردہ کر رکھا تھا اور جو اپنی ناگفتہ بہ حالت کو قہرِ خداوندی سے منسوب کرتے تھے۔ کلمۃ اللہ ان کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ درحقیقت مبارک حال ہیں یہ استاد ازل اپنے سامعین کو بتلاتا ہے کہ وہ اشخاص بھی مبارک ہیں جو راستبازی کے بھوکے اور پیاسے ہیں۔ جو رحم دل اور پاک دل اور صلح کر گرویدہ ہیں۔ دنیا ایسے اشخاص کو ان باتوں کی خاطر ضرور ستائیگی۔ لیکن یہ برگزیدہ اشخاص لعن طعن کی پروانہ کرینگے۔ بلکہ خوش وشادمان ہونگے۔ کیونکہ خدا کی بادشاہت انہیں کی ہے۔ ان چیدہ ہستیوں کی تعداد تھوڑی ہو گی۔ لیکن وہ زمین کے نمک اور دنیا کے نور ہونگے جو تاریکی کے فرزندوں کے رہنما ہونگے تاکہ ان کو آفتابِ صداقت کے قدموں میں لائیں۔

ع ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شُد

منجئی عالمین ابتدا میں اپنے قوانین اور موسوی شریعت میں رشتہ اور تعلق بتاتے ہیں۔ انبیائے سلف کی شریعت باطل نہ تھی۔ لیکن غیر مکمل تھی۔ ابن اللہ کی بعثت کی وجہ یہ تھی کہ اس ناکمل اورظاہری شریعت کی تکمیل کی جائے۔ چنانچہ صاحب اختیار کلمۃ اللہ (مرقس ۱: ۲۲) نے اپنی روحانی شریعت کا چند ایک قدیم شرعی قوانین پر اطلاق فرما کر اس بات کو واضح کردیا۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ شرعی حکم " توخون نہ کر" (خروج ۲۰: ۱۳) کا مطلب محض جان سے مارنا ہی نہیں بلکہ کسی سے ناجائز غصہ کرنا یا کسی کو بنظرِ حقارت ونفرت دیکھنا اس کا خون کرنا ہے۔ جس کی سزا جنابِ باری سے ضرور ملیگی۔ اسی طرح شرعی حکم" توزنا نہ کر" (استثنا ۵: ۱۸) کی نسبت

فرمایا کہ زنا محض ظاہری فعل کا ہی نام نہیں بلکہ بُری خواہش زنا کی مترادف ہے۔ پس ہم کو اس سے محترز رہنا چاہیے۔ کلمۃ اللہ نے حالت ازدواج کو دائمی قرار دے دیا اور طلاق اور اس کے بد نتائج کا قلع قمع کردیا۔ شرعی حکم " توجھوٹی قسم نہ کھا"(احبار ۱۹: ۲۱) کی نسبت آپ نے فرمایا کہ جھوٹی یا سچی قسم کھانے کی مطلق ضرورت ہی نہیں کیونکہ کوئی کلام ایسا نہیں جو خدا کی حضوری میں نہ کیا جاتا ہو۔ انتقامی شرعی قوانین (خروج ۲۱: ۲۴۔ احبار ۱۹: ۱۸) کی نسبت آپ نے فرمایا کہ یہ قوانین زمانہ سلف کے لوگوں کے دلوں کی سختی کی وجہ سے وضع کئے گئے تھے۔ لیکن انتقام کی خواہش ایک بُرا جذبہ ہے جو انسانی طبائع کو نیکی کی طرف مائل نہیں کرسکتا اگر بدی کا مقابلہ بدی سے کیا جائے تو دنیا میں نیکی کس طرح پھیل سکیگی؟ لہذا سیدنا مسیح نے فرمایا" شریر کا مقابلہ نہ کرنا" تاکہ بدی کو نیکی سے مغلوب کیا جائے۔ دشمنوں سے محبت رکھو اور ستانے والوں کے لئے دعا مانگو تاکہ تم اپنے آسمانی باپ کے بیٹے کھلانے کے مستحق ٹھہرو کیونکہ وہ اپنے سورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے۔ پس چاہیے کہ تم کامل ہو جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے"۔

سیدنا مسیح نے یہ حکم دیا کہ راستبازی کے کام محض آدمیوں کو دکھاوے کی خاطر نہ کئے جائیں ۔ ریاکاری کی آلائش تک بھی موجود نہ ہو۔ مثلاً جب خیرات کی جائے تو کوچوں اور شاہراوں میں نہ کی جائے تاکہ لوگ خیرات کرنے والے کی بڑائی کریں۔ بلکہ خیرات پوشیدہ ہونی چاہیے۔ یہاں تک کہ " جو تیرا دہنا ہاتھ کرتاہے اسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے" ۔ اسی طرح روزہ اس واسطے نہ رکھا جائے کہ لوگ روزہ دار جانیں بلکہ روزے کا کسی کو علم تک نہ ہونا چاہیے ۔ جب خدا سے دعا کی جائے تو بازاروں کےموڑوں پر کھڑے ہو کر لمبی چوڑی دعا نہ کی جائے اور مقصد یہ نہ ہو کہ لوگ ان کو مرد دعا کہیں بلکہ دعا پوشید گی میں کوٹھڑی کےاندر دروازہ بند کرکے کی جائے۔ کلمۃ اللہ نے اپنے حواریوں کو ایک مختصر دعا بطور نمونہ سکھائی جس میں گویا دریا کوزہ میں بند کردیا ہے۔آپ نے اس دعا کے ذریعہ تعلیم دی کہ انسان کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ وہ خدا کی مرضی پر چلے تاکہ خدا کی بادشاہت زمین پر بھی قائم ہو۔ جس طرح وہ آسمان پر موجود ہے تاکہ آسمانی باپ کے نام کی تقدیس ہو۔ انسانی حاجتیں اسی اعلیٰ ترین مقصد کے ماتحت ہیں۔ روزانہ ضروریات کا پورا ہونا گناہوں کی مغفرت اور برائی سے بچنا۔ اسی اعلیٰ مطمع نظر کوحاصل کرنے کاوسیلہ ہیں۔

منجئی عالمین کی تعلیم میں زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ ہم خدا اور اس کی مرضی کو تمام باتوں پر ترجیح دیں۔ اگر ہم خدا پر کامل بھروسہ رکھینگے توسب باتیں سر انجام پاجائینگی۔ خدا اور غیر خدا دونوں ہمارے دلوں پر حکمران نہیں ہوسکتے ۔" کوئی شخص دومالکوں کی خدمت نہیں کرسکتا"۔ انہی معنوں میں ہمارا خدا "غیور" خدا ہے۔ وہ اس بات کی برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کے سوا کوئی اورشے بھی ہمارے دلوں پر حکمران ہو کر اس کی جگہ غضب کرلے۔ پس کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ" پہلے تم خدا کی بادشاہت اور اسکی راستبازی کی تلاش کرو"۔ اگر ہم

خدا پر کامل بھروسہ رکھینگے تو وہ ہماری خبر گیری فرمائیگا۔ جس طرح وہ پرندوں کی خبر گیری کرتاہے ۔وہ ہمیں بھی پوشاک عطا کریگا۔ کیونکہ وہ پھولوں کو ایسی پوشاک دیتا ہے کہ" سلیمان بھی باوجود اپنی تمام شان وشوکت کے ان میں سے کسی مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا"۔ اس لئے تم اپنی جان کا فکر نہ کرنا کہ۔ ہم کیا کھائینگے یا کیا پیئینگے نہ اپنے بدن کا کہ کیا پہننگے"۔ فکر کرنا حماقت ہے فکر کیا کرسکتاہے؟ ہم کل کی فکر کو خدا پر جو ہمارا پروردگار اور باپ ہے۔ چھوڑدیں اور روزانہ ضروریات کے پورا ہونے کے لئے اس کے شُکر گذار ہوں اور اس کی مرضی کو سب باتوں پر مقدم سمجھ کر اس پر عمل کریں۔ کیونکہ جو اس پر عمل نہیں کریگا۔ وہ خدا کی بادشاہت میں ہر گز داخل ہونے نہ پائیگا۔

(۱۱)

خدا کی بادشاہت کی عالمگیری:

سیدنا مسیح نے " پہاڑی وعظ" میں اپنی بادشاہت کے قوانین وضع فرمائے جو لازوال اور بے تبدیل ہیں اور کبھی منسوخ نہیں ہوسکتے ۔ یہ قوانین یہودی شریعت کی طرح تنگ اور کسی خاص قوم سے مختص نہیں ہیں بلکہ عالمگیر ہیں اور ہر قوم اور ہر ملک اور ہر زمانے کے ہر فرد بشر کے لئے وضع کئے گئے ہیں موسوی شریعت باطل نہ تھی لیکن غیر مکمل ضرور تھی کیونکہ وہ صرف اہل یہود کے لئے وضع کی گئی تھی پس اس کا اطلاق روئے زمین کی اقوام کے افراد پر نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن خدا کی بادشاہت صرف اہلِ یہود کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر " ایک قوم اور قبیلے اورُامت اور اہلِ زبان کے بے شمار" لوگوں کے لئے ہے(مکاشفہ ۷: ۹)۔

عام ہے یار کی تجلی میر
خاص موسیٰ و کوہِ طور نہیں

پس ضروری تھا کہ اس سلطنت کا سلطان اس غیر مکمل شریعت کی تکمیل کرے اور اس کی تنگ حدود کو اتنا وسیع کردے کہ وہ کل بنی نوع انسان پر حاوی ہوسکے۔ کلمۃ اللہ نے شریعت کے مختلف حصص میں تمیز کرکے مقدم حصص کو لازم اور عارضی حصص کو جن کا تعلق صرف یہودی قوم سے ہی تھا۔ غیر ضروری قرار دے دیا۔ بعض احکام مثلاً انصاف، رحم، ایمان " وغیرہ لازمی اور ضروری تھے (متی ۲۳: ۲۳) لیکن قیود شرعیہ کو جو عالمگیریت کے منافی تھیں اورظاہری رسوم کو درحقیقت "بھاری بوجھ" تھے(متی ۲۳: ۴) آپ نے منسوخ کردیا۔(متی ۲۳: ۱، ۴، ۱۵، ۲۳- ۹: ۱۳- ۱۲: ۷ وغیرہ) یہ قیود موخر ہیں اور اخلاقی فرائض اور روحانی اصول مقدم ہیں (مرقس ۷: ۱۵، ۲۳- ۱۲: ۲۳- ۳۴- متی ۹: ۱۳ وغیرہ)۔

فریسیوں اور معلمان شرع کو ملامت کرنے میں کلمۃ اللہ نے شریعت کی تنگدستی اور تہدستی کو لوگوں پر ظاہر کردیا ۔ ہم کلمۃ اللہ کی مشکلات کا اندازہ کرسکتے ہیں کیونکہ جب ہوسیع نبی نے کہا تھا کہ خدا فرماتا ہے کہ" میں قربانی

پسند نہیں کرتا بلکہ رحم چاہتا ہوں "(۶ : ۶) اس وقت موسوی شریعت احاطہ تحریر میں نہیں آئی تھی۔ اور ہوسیع نبی کو کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا لیکن جب کلمۃ اللہ نے یہ الفاظ اپنی زبانِ مبارک سے فرمائے اس وقت موسوی شریعت کی کتب معلموں اور ربیوں کے ہاتھوں میں موجود تھیں اوران میں قربانیوں کا گذراننا اوردیگر قیود شرعیہ کاادا کرنا لازم قرار دیا ہوا تھا۔ لیکن آپ نے قیود شرعیہ کی جڑ پر کلہاڑا مارا پس آپ میں اور معلمانِ شرع میں کش مکش شروع ہوگئی۔ موسوی شرع کے اندر مختلف احکام میں تقدیم وتاخیر کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ کیونکہ تمام احکام یکساں طورپر احکام الہیٰ تھے ۔خواہ وہ اخلاقی اور روحانی فرائض ہوں یا قیود شرعیہ ہوں اوران کی یکساں طور پر بجاآوری ہر یہودی کا فرض خیال کیا جاتا تھا۔ان کی نظر میں خدا کو اپنے سارے جی، جان، عقل اور زور سے پیار کرنے کا حکم خرگوش کے گوشت کو نہ چکھنے کے حکم کے برابر تھا۔ یہودی ربیوں کے خواب وخیال میں بھی یہ بات کبھی نہ آتی کہ چونکہ رحم کرنا خرگوش کھانے سے بہتر ہے ۔لہذا اگرہم خرگوش کا گوشت کھائیں تو کچھ مضائقہ نہیں بشرطیکہ ہم رحم کریں [83]۔ کلمۃ اللہ نے جو عہد عتیق کے احکام کو ضروری اور عارضی حصوں میں منقسم کیا وہ یہودی ربیوں اورعالمانِ شرع کی نظر میں کفر سے کم نہ تھا۔

[83] Montefiore, Religious Teachings of Jesus .p.51.

مثال کے طور پر ہم حرام اورحلال خوارک کو لیں۔ یہودی ربی کسی اور امر پر اتنا زور نہیں دیتے تھے جتنا وہ اس سوال پر زور دیتے تھے [84]۔ کیونکہ خوراک کے احکام پر روز مرہ عمل کرنا ہوتا تھا لیکن حرام وحلال کے اصول حقیقی روحانیت کے خلاف تھے ۔خدا کی بادشاہت صرف اہل یہود پر ہی مشتمل نہ تھی بلکہ وہ روئے زمین کے باشندوں کے لئے تھی لہذا یہ اصول عالمگیر یت کے خلاف تھے۔ پس کلمۃ اللہ نے حرام حلال کی تمیز کو مٹادیا اوران احکام کو رد کردیا (مرقس ۷: ۹ وغیرہ) کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ کسی مادی شے کے کھانے سے روح ناپاک نہیں ہوجاتی صرف بُرے خیال اورافعال ہی روح کو ناپاک کرسکتے ہیں۔ بیرونی اشیاء انسانی روح کو ناپاک نہیں کرسکتیں۔ انسانی روح صرف باطنی طور پر ناپاک ہوسکتی ہے اگر کلمۃ اللہ کا یہ قول صحیح ہے تو شرعی قیود غلط ثابت ہوئیں اور اگر شرعی قیود صحیح ہیں تو کلمۃ اللہ کا اصول غلط ہوگا۔ پس چونکہ شرعی قیود اس روحانی اصول کے سراسر منافی تھیں اور یہ اصول حق تھا۔ لہذا کلمۃ اللہ نے ان قیود کو رد کرکے خدا کی بادشاہت کےقانون کو عالمگیر کردیا۔

اسی طرح ابن اللہ نے یہود کا یہ خیال کہ صرف آلِ ابراہیم ہی خدا کی برگزیدہ قوم ہے جن کا وہ خالق اورسلطان ہے ، حقیقی روحانیت کے خلاف پایا اور تمام عمر آپ اس خیال کے خلاف جہاد کرتے رہے یہود کا یہ عقیدہ ایک قومی

[84] Ibid p.47.

عقیدہ تھا ان یہ خیال تھا کہ بنی اسرائیل کا ہر فرد خدا کی بادشاہت میں شریک ہوگا۔ لیکن سیدنا مسیح نے ان کو خبردار کیا اور فرمایا کہ آلِ ابراہیم سے ہونا خدا کی بادشاہت کی ٹکٹ نہیں اور نہ یہودی اس کے اجارہ دار ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ اس بادشاہت میں داخل ہونا ہر شخص کے اعمال صالح پر منحصر ہے۔ خواہ وہ آلِ ابراہیم سے ہو یا نہ ہو۔ بلکہ ایسے لوگوں کو جو اپنے نسب پر تکیہ کئے بیٹھے تھے آپ نے فرمایا کہ " میں تم سے کہتا ہوں کہ بہتیرے پورب اور پچھم سے آکر ابراہیم اور اضحاق اور یعقوب کے ساتھ آسمان کی بادشاہت کی ضیافت میں شریک ہونگے مگر بادشاہت کے بیٹے (اہل یہود) باہر اندھیرے میں ڈالے جائینگے "(متی ۸: ۱۱تا ۱۲) آپ نے یہ تعلیم دیکہ خدا ہر فرد بشر کا باپ ہے خواہ اس کی اصل نسل کچھ ہی ہو۔ وہ راست اور ناراست آدمیوں کا باپ ہے۔(متی ۵: ۴۵)وہ اپنے فرزندوں کا پروردگار ہے اورچاہتا ہے کہ ہر فرد بشر اس سے محبت رکھے ۔ وہ کسی گنہگار کی موت نہیں چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں سے باز آئے اور زندہ رہے۔ پس آپ نے خدا کی بادشاہت کا دروازہ کل دنیا کے مومنین کے لئے کھول دیا۔

علیٰ ہذا القیاس کلمۃ اللہ نے روزہ، نماز کی قیود۔ تعداد ازدواج اورطلاق کی اجازت ، غسل وطہارت اورہاتھ دھونے وغیرہ کے احکام کو حقیقی روحانیت اور خدا کی بادشاہت کی عالمگیریت کے خلاف پایا اوران کو یکسر رد کردیا(مرقس ۱۲: ۲۳تا ۲۶- ۲: ۱۸تا ۲۰- ۷: ۱تا ۲۳ - ۷: ۱۹- ۱۰: ۵تا ۹ وغیرہ) آپ نے جیسا ذکر کیا گیاہے۔ شرعی احکام کو لازمی اور غیر ضروری حصوں میں منقسم کرکے ان میں عالمگیریت کی اہلیت پیدا کردی۔ پس کلمۃ اللہ کی تعلیم" کورے کپڑے کا پیوند" نہیں ہے جو یہودیت کی پرانی پوشاک" میں لگایا گیا ہو بلکہ آپ کی تعلیم کے تانے بانے میں یہودی کتب سماوی کے تمام روحانی اصول بُنے گئے ہیں۔ آپ نے لازمی احکام کو اعلیٰ مطمع نظر کے ماتحت کرکے شریعت کو اس کے اصلی اوراعلیٰ مفہوم کے مطابق کامل کردیا۔ مثلاً شرعی حکم " توخون نہ کر" کو یوں کامل کیا کہ اس کے ماخذ ناجائز غصہ کو ممنوع قرار دے دیا(متی ۵: ۲۱تا ۲۶)علیٰ ہذا القیاس شرعی حکم " توزنا نہ کر" کویوں کامل کیا کہ اس کے ماخذ ناجائز خواہش کو ممنوع قرار دے دیا(متی ۵: ۲۵تا۲۷)۔ احکام شرعیہ کا معیار جس سے سیدنا مسیح نے ضروری احکام کو غیر ضروری احکام سے جدا کیا تھا کہ آیا وہ احکام حقیقی روحانیت کا مظہر ہیں یا نہیں(متی ۱۹: ۸-۲۳: ۲۳وغیرہ)۔

یہودی عالم ڈاکٹر مانٹی فیوری اپنی تفسیر اناجیل ثلاثہ کی تمہید میں سیدنا مسیح اور شریعت کے سوال پر بحث کرتا ہوا کہتا ہے کہ "سیدنا عیسیٰ نے سبت کے قوانین اور حرام حلال کھانوں وغیرہ پر حملہ کیا اس کی بصیرت اور روحانی روشنی اور خالص مذہبی روح کے سامنے سخت رکاوٹ پیش آئی شریعت کہتی تھی کہ اس کی رسوم ایک کامل خدا کے احکام ہیں اور ان کی ادائیگی واجبات میں سے ہے۔ یہ امر مسیح اوراس سے پہلے استادوں کے درمیان متنازعہ فیہ تھا اور

کش مکش کا شروع بھی اسی سے ہوا۔ ممکن ہے کہ یہودی ربی مثلاً حلیل وغیرہ کے خیال میں آیا ہو کہ اخلاقی قوانین حرام حلال کی قیود سے بہتر ہیں۔ لیکن وہ اس مضمون پر کبھی اس طرح آزادانہ بحث نہ کرتے جس طرح سیدنا مسیح نے کی۔ حلیل ہمیشہ شریعت کا خادم ہی رہا اور اس کی تنقید کرنے کی جرات خواب وخیال میں بھی اس کو کبھی نہ ہوئی[85]۔ لیکن جہاں حلیل شریعت کا خادم تھا وہاں کلمتة اللہ شریعت کے مالک تھے آپ نے لازمی احکام کا معیار حقیقی روحانیت مقرر کیا اور جو احکام اس معیار پر پورے نہ اترے وہ غیر ضروری قرار دے دیئے گئے۔

پس خدا کی بادشاہت کی عالمگریت اس سے ثابت ہے کہ اس کے قوانین عالمگیر ہیں ان میں ظاہری رسوم اور قیود شرعیہ کا قطعی نام تک موجود نہیں۔ یہودیت کے اصول ان قیود میں مقید تھے۔ لہذا اس میں عالمگیریت کی صلاحیت موجود نہ تھی[86]۔ لیکن چونکہ کلمتة اللہ کے اصول تمام روحانی ہیں وہ زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہیں لہذا ان کا اطلاق ہر ملک، قوم ملت اور طبقہ کے لوگوں پر ہوسکتا ہے۔

---

[85] Montefiore Synoptic Gospels.vol.1.p.cxix.
[86] Ibid .p. c i.

(۱۲)

چند اعتراضات کے جواب:

بعض اصحاب کہتے ہیں کہ مسیحیت کی عالمگیریت کا ذمہ وار کلمتة اللہ نہیں بلکہ آپ کا رسول پولوس ہے۔ لیکن مندرجہ بالا امور سے ارباب دانش پر ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ۔کلمتة اللہ نے ایک ایسا طریق جاری کیا جو عالمگیر تھا۔ چنانچہ فاضل یہودی ربی ڈاکٹر کلاسنر Klausner کہتا ہے کہ " بہت یہودی اور عیسائی خیال کرتے ہیں کہ مسیح کی تعلیم کے عبرانی عناصر کی جگہ پولوس نے مسیحیت میں یونانی عناصر داخل کردئے تھے۔ لیکن ہمیں یادرکھنا چاہیے کہ جس قسم کا درخت ہوتا ہے۔ ویسا ہی اس کو پھل لگتا ہے۔ اگر سیدنا عیسیٰ کی تعلیم میں ایسے اجزا نہ ہوتے جو یہودیت کے خلاف تھے۔ تو کبھی کوئی ایسی نئی تعلیم پیدا نہ ہوتی جو یہودیت کے اس قدر نقیض ہے۔ نیستی سے کوئی شے ہست نہیں ہوسکتی۔ سیدنا عیسیٰ کی تعلیم میں یقیناً ایسے عناصر پہلے ہی سے موجود تھے۔ جن کا مابعد کے زمانہ میں بڑھ کر یہودی تعلیم کے نقیض ہونا ایک لازمی امر[87] تھا۔ یہی عالم ایک اور جگہ کہتا ہے کہ " اگر سیدنا عیسیٰ کی تعلیم میں اس قسم کے اجزا نہ ہوتے تو فریسی ساؤل کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ آتی کی شرعی احکام

---

[87] Klasuner, Jesus of Nazareth.p.9.

وغیرہ کورد کیاجائے اور نہ اس بات کو مسیحیت کا قانون بنانے میں اس کو کبھی کامیابی حاصل ہوتی[88]۔

بعض نکتہ چین کہتے ہیں کہ سیدنا عیسیٰ صرف ایک یہودی مصلح تھے اورآپ کے خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ آپ ایک عالمگیر بادشاہت کے بانی ہونگے۔ اس ثبوت میں وہ کہتے ہیں کہ جناب مسیح نے سور فینیکی عورت کو فرمایا تھا کہ " میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی اور کے پاس نہیں بھیجا گیا"(متی ۱۵: ۲۴)۔[89]

لیکن ہم سطور بالامیں ذکر کرچکےہیں کہ بابل کی اسیری کےوقت سے ہی اہل یہود کو اس امر کا احساس ہوگیا تھا کہ ان کے وجود کا واحد مقصد یہ تھا کہ غیر یہود کو خدا کی نجات کا پیغام سنائیں (یسعیاہ ۴۲: ۶۔ ۴۵: ۶۔ ۵۶: ۶۔ صفنیاہ ۳: ۹۔ حبقوق ۲: ۱۴۔ زبور ۲۲: ۲۷تا ۳۱۔ ۶۵: ۲تا ۶۔ ۸۶: ۹۔ ۸۷: ۴تا ۷۔ میکاہ ۵: ۷۔ ملاکی ۱: ۱۱وغیرہ) سیدنا عیسیٰ کے ہم عصر یہود بت پرستوں اورمشرکوں میں اپنے دین کی اشاعت کیا کرتے تھے۔(متی ۲۳: ۱۵۔ اعمال ۱۵: ۲۱) کیا کلمۃ اللہ اپنے ہم عصر یہود سے زیادہ تنگ خیال تھے؟ خود سیدنا مسیح کا لائحہ عمل اس اعتراض کو رد کردیتاہے۔ سیدنا عیسیٰ نے " غیر قوموں کی گلیل " کو اپنا وطن بنایا(متی ۴: ۱۵) آپ صور وصیدا" کے سرحدوں میں گئے(مرقس ۷: ۲۴)پھر وہاں سے نکل کرآپ دکپلس کی سرحدوں میں گئے (مرقس ۷: ۳۰) اوران علاقوں کے بیماروں کو شفا بخشی۔ اسی طرح ادومیہ سے اور یردن کے پار اور صوبہ صیدا کی آس پاس کی ایک جمِ غفیر نے سیدنا مسیح کی تعلیم سے فیض پایا (مرقس ۳: ۸) آپ سامریہ میں گئے (لوقا ۹: ۵۲) اور سامریوں کو تعلیم دی (یوحنا ۴: ۴۔ ۴۲)۔ آپ نے سامری کوڑھی کو شفا عطا کی (لوقا ۱۷: ۱۵) حالانکہ یہودیوں اور سامریوں میں سخت عناد تھا۔ آپ نے رومی صوبہ دار کے خادم کو شفا عطا کی گورومی فاتحین او ریہودی مفتوحین ایک دوسرے سے متنفر تھے۔ آپ نے سور فینیکی عورت کی بیٹی کو جو یونانی اور بت پرست تھی شفا عنایت کی۔

جب ہم منجئی عالمین کے اقوال پر نظر تے ہیں ۔ توہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے صاف فرمایا" بہتیرے پورب اور پچھم سے آکر ابراہیم اور اضحاق اوریعقوب کے ساتھ آسمان کی بادشاہت میں شریک ہونگے۔ لیکن بادشاہت کے بیٹے (یہودی باہر اندھیرے میں ڈال دئے جائینگے"(متی ۸: ۱۱) آپ نے حواریوں کو فرمایا کہ وہ اہل یہود اور غیر یہود دونوں میں آپ کے گواہ ہونگے (متی ۱۰: ۱۸) سیدنا مسیح کی تمثیلیں اس پر شاہد ہیں۔ چنانچہ آپ نے کڑوے دانے کی تمثیل کو سمجھا کر فرمایا "اچھے بیج بونے والا ابن آدم ہے اورکھیت دنیاہے"(متی ۱۳: ۳۸) انگوری باغ کی تمثیل میں آپ نے فرمایا کہ خدا کی بادشاہت آل ابراہیم سے لے لی جائیگی اور غیر یہود اس میں داخل

[88] Ibid.pp.275-276

[89] اس اعتراض پر ہم نے ایک مستقل رسالہ "اسرائیل کا نبی یاجہان کا منجی" لکھاہے۔ برکت اللہ

ہونگے(متی ۲۱: ۴۳) بکریوں اور بھیڑوں کی تمثیل میں آپ نے فرمایا کہ" جب ابن آدم جلال میں آئیگا تو سب اقوام اس کے حضور حاضر کی جائینگی"۔ (متی ۲۵: ۲۲) سیدنا مسیح نے شاگردوں کو یہ وصیت فرمائی "تم تمام دنیا میں جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ"(متی ۲۸: ۱۹)۔

پس سیدنا مسیح کا طرزِ عمل ۔لائحہ عمل اور کلماتِ طیبات سب صاف طور پر ثابت کرتے ہیں کہ کلمۃ اللہ نے اپنے آپ کو یہودی مصلح ہی نہیں بلکہ منجئی عالمین تصور فرماتے تھے ۔یہی وجہ ہے کہ سیدنا مسیح نے جونام اپنے لئے منتخب فرمایا وہ ابن داؤد نہیں بلکہ " ابن آدم" تھا۔ نہایت دلی آرزو کے ساتھ آپ تمام دنیا کو دعوت دیتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں ۔"اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو سب میرے پاس آؤ میں تم کو آرام دونگا"(متی ۱۱: ۲۸)۔

ع ہست میکدہ ودعوت عام است ایں جا

معترض پوچھ سکتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو سیدنا مسیح نے کیوں فرمایا کہ" میں اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا "۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خدانے اہل یہود کو اس واسطے اقوام عالم سے چن لیا تھا تاکہ وہ تمام دنیا میں اس کا علم پھیلانے کا وسیلہ ہوں۔ الہٰی انتظام نے مختلف اقوام کو مختلف نعمتیں عطا کی ہیں۔ اگر ہندوستان اور یونان کو فلسفہ عطا کیا ہے تو روما کو قوانین وضع کرنے کی نعمت عطا فرمائی۔ چنانچہ یونان وہند نے تمام دنیا میں علم وفلسفہ پھیلایا اور روم نے دنیا کو قوانین وضع کرنے کا علم سکھایا۔ اسی طرح قدرت نے اہل یہود کو یہ خدمت سپرد کی کہ دنیا میں خدائے واحد کی ہستی اور اس کی ذات وصفات اور نجات کا علم پھیلائیں ۔غیر اقوام بت پرست تھیں۔ نہ خدا کی جانتی تھیں نہ انبیاء ان میں معبوث ہوئے تھے اور نہ صحف سماوی ان کے پاس تھیں نہ وہ مسیح موعود کی منتظر تھیں برعکس اس کے اہل یہود موحد تھے۔ اہل کتاب تھے مسیح موعود کے منتظر تھے ۔پس منجئی کونین نے اس قوم میں کام کیا۔ جس میں خدا نے خاص طور پر اپنا علم ودیعت کررکھا تھا تاکہ اس قوم کو آپ خدا کا پُر محبت پیغام سنائیں اور وہ دیگر اقوام میں اس پیغام کی اشاعت کرے۔ سیدنا مسیح نے اسی واسطے اپنے یہودی شاگردوں کو وصیت کی تھی کہ" تم تمام دنیا میں جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ(متی ۲۸: ۱۹) اور تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ مسیحیت کا جانفزا پیغام انہی بے دست وپا یہودی شاگردوں کے ذریعہ تمام دنیا میں پھیلا اور دنیا کے گوشے گوشے اور کونے کونے اور چپے چپے میں پہنچا۔

پس ہر منصف مزاج شخص انجیل شریف کے مطالعہ سے یہی نتیجہ اخذ کریگا کہ منجئی جہان کی نظر دنیا کی کل اقوام پر تھی۔ مہاتما بدھ نے برہمنوں کی ذات پات کی قیود کے خلاف پرچار کیا اور کہا" میرا قانون تمام ذاتوں کے لئے

ہے"۔ اور اس کے چیلے یہی سمجھے کہ بُدھ کا مطلب یہ تھا کہ بدُھ مت ایک تبلیغی مذہب ہے جس میں براہمن اور شودر دونوں داخل ہوسکتے ہیں۔ سیدنا مسیح کے شاگرد بھی اپنے آقا ومولا کے لائحہ عمل ۔ طرز عمل۔ مطمع نظر اور تعلیم سے یہی سمجھے کہ آپ نے جس طریق کی بنیاد ڈالی وہ اقوام عالم کے لئے ہے اور یہود اور غیر یہود دونوں خدا کی بادشاہت میں داخل ہوسکتے ہیں چنانچہ یہودی عالم ڈاکٹر مانٹی فیوری کہتاہے کہ " سیدنا عیسیٰ نے اہلِ یہود کی قومی تنگ نظری کو بالکل نظر انداز کردیا اس امر میں اس کے خیالات اپنے ہم عصروں سے کہیں بلند وبالا تھے۔ جہاں تک ان غیر مکمل متعصب اور یک طرفہ انجیلی بیانات سے پتہ چل سکتاہے ہم کو اقبال کرنا پڑتاہے ۔ کہ سیدنا عیسیٰ اپنی بادشاہت کو کوئی یہودی سلطنت خیال نہیں کرتا تھا اس میں یہود کو غیر یہود پر کوئی فضیلت نہیں[90]۔ یہودی فاضل ڈاکٹر کلاسنر کہتاہے کہ " سیدنا عیسیٰ نے یہودی انبیاء کی تعلیم میں سے قومی اورسیاسی امیدوں کوخارج کردیا۔ اوراپنی تعلیم کوعالمگیر بنادیا[91]۔

علاوہ ازیں اس الہیٰ سلطنت کا سلطان ایک کامل انسان تھا (یوحنا ۵: ۱۹۔ ۵: ۳۰۔ ۱۴: ۳۱) آپ خدا کی ذات کاملہ کے افضل ترین مظہر تھے۔(یوحنا ۱۷: ۴) لہذا آپ اپنی سلطنت کے شرکاء کے لئے ایک کامل نمونہ تھے۔ آپ سخت ترین آزمائشوں پر غالب رہے۔(متی ۴: ۳۔ ۱۱۔

[90] Montefiore , Religious Teachings of Jesus Christ.p.71.
[91] Klausner, Jesus of Nazareth p.117.see also pp.369-411

مرقس ۱۴: ۳۶وغیرہ)۔ آپ نے خود اپنی زبان حقائق ترجمان سے فرمایا" جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا"(یوحنا ۱۴: ۹) آپ کے خون کے پیاسے آپ کی عصمت پر گواہ تھے(یوحنا ۸: ۴۶۔ متی ۲۷: ۲۴۔ مرقس ۱: ۲۴)۔ آپ کے حواری جو شب وروز آپ کے گواہ تھے آپ کی عصمت اور بے گناہی کا اقرار کرتے ہیں (عبرانیوں ۷: ۲۶۔ ۴: ۱۵۔ ۲کرنتھیوں ۵: ۲۱۔ ۱یوحنا ۳: ۵) فرشتگان آپ کی عصمت کے گواہ ہیں (لوقا ۱: ۳۵) خود اللہ تعالیٰ آپ کی بے گناہی پر مہر کرتاہے(مرقس ۱: ۱۱۔ ۹: ۷وغیرہ) آپ کا حال یہ تھا کہ

صور تش برخاک وجاں برلامکاں
لامکانے فوق وہم سالکاں

(مولانا روم)

پس منجئی عالمین کے اقوال وافعال۔ آپ کی نصائح اور طرزِ عمل آپ کی تعلیم کے اصول اورآپ کا کامل نمونہ تمام اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ آپ کی تعلیم عالمگیر ہے۔ اور تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ آپ کی تعلیم ہر ملک اور قوم اورطبقہ میں ہر آب وہوا اور فضا میں پھلتی پھولتی رہتی ہے۔ مسیحیت کی تعلیم ہر زمانہ اور ہرملک اور ہر قوم کے ہر فرد کے ساتھ سازگاری کرسکی ۔ جہاں جہاں کلمۃ اللہ کی تعلیم گئی اس نے ہر دفعہ اور ہر ماحول اور ہر زمانہ میں کامیابی کے ساتھ رائج ہونے کی قابلیت کا ثبوت دیا اس کے قانون کلی تمام ممالک اور

ازمنہ کے اصول وکلیاتِ تمدن معاشرت اقتصاد اور ارتقائے ذہنی وروحانی کا جامع ہو کر بہ آسانی تمام جزئیات کا استخراج کرسکنے کی استعداد اورقابلیت رکھتے ہیں اس کی مکمل وجامع تعلیم تمام ملک کے ہر شعبہ زندگی پر حاوی ہونے کی مدعی رہی ہے اور نظامِ عالم کی شیرازہ بندی کرتی آئی ہے۔

باب چہارم

کلمۃ اللہ کی ذات کے بارے میں انجیل شریف کی تعلیم

کلمۃ اللہ نے اپنی خدمت کی ابتدا میں ناصرت کے عبادت خانہ میں یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں سے ایک مقام پڑھ کر فرمایا کہ "آج یہ نوشتہ تمہارے سامنے پورا ہوا ہے"۔ (لوقا ۴: ۲۱)وہ مقام یہ تھا" خداوند کا روح مجھ پر ہے اس لئے کہ اس نے مجھے غریبوں کو خوشخبری دینے کے لئے مسح کیا۔ اس نے مجھے بھیجا ہے کہ قیدیوں کو رہائی اوراندھوں کو بینائی پانے کی خبر سناؤں کچلے ہوؤں کو آزاد کروں اور خداوند کےسال مقبول کی منادی کروں"(لوقا ۴: ۱۸تا ۱۹)۔ آپ نے ان آیات کا اقتباس کرتے وقت الفاظ" ہمارے خدا کے روزِ انتقام کا اشتہار دوں" کو جو صحیفے میں لکھے تھے نہ پڑھا بلکہ ان کو دیدہ دانستہ چھوڑدیا اوریوں بنی اسرائیل کو اپنی رسالت کے مقصد سے آگاہ فرمایا۔ ابتدائی مسیحی اس مطلب خیز فردگذاشت کو ذیل کے الفاظ میں بیان کرتا ہے " کیا سیدنا مسیح دنیا میں حکومت کرنے اور لوگوں کے دلوں میں خوف اوردہشت اورہیبت بٹھانے کے لئے بھیجا گیا تھا؟ ہر گز نہیں ۔ خدا نے اس کو نرمی

اور انکساری سے بھیجا تا کہ وہ دنیا کو محبت کے ذریعہ نجات دے اور گنہگاروں کے دلوں کو خدا کی جانب راغب کرے نہ کہ وہ تشدد سے کام لے۔ کیونکہ تشدد کا خدا کے ساتھ کسی قسم کا کوئی واسطہ نہیں ہے[92]۔

خداوند کا خوف اوقات پر صحفِ انبیاء کے مقامات کا اپنی ذات پر اطلاق کرنا (لوقا ۴: ۲۱۔ ۲۲: ۲۲ وغیرہ)۔ اس امر کو صاف ظاہر کرتاہے کہ آپ کا خیال تھا کہ آپ پروہ پیشین گوئیاں صادق آتی ہیں جو عہدِ عتیق کی کتب مقدسہ میں موجود ہیں۔ اور کہ آپ دنیائے مذہب میں ایک نیا دور شروع کرنے آئے تھے۔ آپ کے خیالِ مبارک میں اس نئے دور کا انحصار اس بے نظیر اورلاثانی رشتہ پر ہے جو آسمانی باپ اور اکلوتے بیٹے میں تھا اس رشتہ کو ظاہر کرنے کے لئے آپ نے اپنے لئے چند خطابات تجویز فرمائے اگرہم ان خطابات پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالیں تو اس رشتہ کی حقیقت اوراہمیت ہم پر ظاہر ہوجائیگی۔

[92] Epistle to Diognetus(7).

(۱)

ابن اللہ:

عہدِ عتیق کی کتب میں یہ خطاب مختلف اوقات پر مختلف برگزیدہ ہستیوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً فرشتوں کے لئے (ایوب ۳۸: ۷)۔یہودی قوم کے لئے (ہوسیع ۸: ۱۔ خروج ۴: ۲۳) قاضیوں کے لئے (زبور ۸۲: ٦) شاہانِ اسرائیل کے لئے (زبور ۸۹۔ ۲سیموئیل ۷: ۱۴) اور مسیح موعود کے لئے زبور(۲، ۸۹) پس یہ خطاب ان لوگوں کے لئے استعمال ہوا تھا۔ جو خدا کے خاص برگزیدے اوراس کی رضا کو پورا کرنے والے تھے۔ کلمۃ اللہ کے زمانہ میں اس خطاب سے اہل یہود بخوبی واقف تھے۔

اناجیل ثلاثہ میں " ابن اللہ " کا خطاب تقریباً ۲۷جگہ سیدنا مسیح کے لئے استعمال کیا گیاہے گو کلمۃ اللہ نے خود اپنی زبانِ مبارک سے اس خطاب کو اپنے لئے استعمال نہیں فرمایا۔ لیکن انجیل اول میں چھ مقامات میں انجیل دوم میں ایک مقام میں اور انجیل سوم میں تین مقامات میں منجئی کونین نے اپنے لئے خاص معنوں میں لفظ" ابن " یا " بیٹا " استعمال فرمایا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے آپ کو ابن اللہ تصور کرتے تھے اورانجیل اول میں قریباً بیس دفعہ انجیل دوم میں دو دفعہ اورانجیل سوم میں نو دفعہ آپ نے اپنی زبانِ حقیقت ترجمان سے خدا کو خاص معنوں میں اپنا " باپ"کہا(متی ۷: ۲۱۔ ۱۰:

۳۲- ۱۱: ۲۷- ۱۵: ۱۳ وغیرہ وغیرہ) قرائن سے معلوم ہوتاہے کہ اناجیل میں جب دیگر اشخاص منجئی عالمین کو" خدا کا بیٹا" کہتے تھے۔ (مثلاً متی ۲۶: ۶۳ وغیرہ) تو اس خطاب سے انکا مطلب صرف " مسیح موعود" تھا لیکن اگر ہم ان مقامات کو غور سے پڑھیں جہاں ہمارے مبارک خداوند نے آپ کو "بیٹا" یا خدا کو اپنا خاص " باپ" کہا ہے تو صاف ظاہر ہوجاتاہے کہ اس خطاب سے خداوند کا مطلب " مسیح موعود" نہیں ہے ۔ مثلاً ذیل کا مقام ملاحظہ ہو" میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا ہے اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوا باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوا بیٹے کے اور اس کے جس پر بیٹا اسے ظاہر کرنا چاہے"(متی ۱۱: ۲۶ تا ۲۷) ایک سطحی نظر ہم پر یہ ظاہر کردیتی ہے کہ یہاں " باپ" اور "بیٹے" کا تعلق ایک لاثانی اور بے نظیر تعلق ہے جس کا" مسیح موعود" کے تصور کے ساتھ کچھ واسطہ نہیں یہ رشتہ جس کا ابن اللہ کو احساس ہے ایک بے عدیل رشتہ ہے۔ اور جس طرح آپ کو اس رشتہ کا احساس ہے اسی طرح آپ کو اس الہیٰ مقصد کا بھی احساس ہے۔ جس کو پورا کرنے کے لئے آپ اس دنیا میں بھیجے گئے آسمانی باپ کا منشا یہ تھا کہ بنی آدم کو آسمان کی بادشاہت عطا کرے (لوقا ۱۲: ۳۲)لیکن یہ بخشش ابن اللہ کے وسیلے حاصل ہوتی ہے۔ جس نے خدا کی محبت اور ابوت کو دنیا پر ظاہر کیا ہے اور جس نے اپنی جان خوشی سے دے دی تا کہ خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو۔ منجئی جہان نے اس مشنِ اور مقصد کی وجہ سے مسیح موعود کا تصور اختیار کیا اور یہ تصورابنیت کا رشتہ مقدم اور مسیح موعود کا تصور موخر تھا۔ آپ کے بپتسمہ کے وقت اورآپ کی مبارک صورت کے بدلنے کے وقت جو الہیٰ آواز سنائی دی اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے اپنی زندگی کی تقدیس رضائے الہیٰ کے مطابق کی ہے۔(متی ۳: ۷-۱۷: ۵) لیکن ابنیت کے احساس کی ابتدا بپتسمہ کے وقت سے نہیں ورنہ " ابن" اور" مسیح" کے تصورات درحقیقت دو نہیں بلکہ ایک ہی ہونگے۔ مقدس لوقا ہم کو بتاتا ہے کہ جب سیدنا مسیح کی عمر بارہ برس کی تھی توآپ کو اپنی اہلیت کا احساس تھا ۔ چنانچہ آپ نے ام المومنین مریم صدیقہ کو مخاطب کرکے فرمایا "مجھے اپنے باپ کے کام میں مشغول ہونا ضرور ہے"(۲: ۴۹) پس ابنیت کا رشتہ اور تصور مقدمہ اور مسیح موعود کا تصور موخر ہے۔ درحقیقت مسیح موعود کا تصورآپ کی ابنیت پر مبنی ہے۔آپ مسیح موعود ہونے کی وجہ سے ابن اللہ نہ تھے بلکہ آپ ابن اللہ ہونے کی وجہ سے مسیح موعود اور آسمانی بادشاہت کے سلطان تھے۔ جرمن نقاد ہارنیک کہتاہے کہ " یہ ظاہر ہے کہ سیدنا مسیح کی ابنیت کا احساس آپ کے مسیح موعود ہونے کے احساس سے مقدم ہے ۔ آپ کو ضرور اس امر کا پہلے احساس ہوا ہوگا کہ آپ کو ان میں اورجب آپ کو ابنیت کا احساس بطرز احسن ہوگیا۔ تب آپ کے خیال میں مسیح موعود کا تصور آیا[93]۔آپ کی زندگی کا مرکزی تصور وہ بے مثال رشتہ ہے جو آپ کوآسمانی باپ کے ساتھ تھا اور جس کو ادا کرنے کے لئے انجیل چہارم نے

[93] Harnac ,Sayings of Jesus .pp.245-246

خطاب " ابن عبید " یا" اکلوتا بیٹا " تجویز کیاہے۔ ہم منجئی عالمین کی تعلیم کو کماحقہ سمجھ نہیں سکتے۔جب تک ہم اس امر کو مدِ نظر نہ رکھیں۔

ابنیت کے رشتہ کی وجہ سے اور ذات الہیٰ کی حقیقی معرفت رکھنے کی وجہ سے ابن اللہ نے مسیح موعود کے تصور کو کلیتہً بدل دیا۔ مسیح موعود کے تصور کے ساتھ سیاسی اور فوق البشریٰ تصورات وابستہ تھے ۔ ابن اللہ نے ان تمام تصورات کو اپنی ابنیت اور خدا کی ابوت کے تصورات کی روشنی میں بدل دیا۔ اور مسیح موعود کا وہ تصور قائم کیا جو آپ کے ہم عصروں کی سمجھ میں نہ آیا۔

ابنیت کا یہ رشتہ ایک بے مثال ، لاثانی اور بے نظیر رشتہ ہے سیدنا مسیح ان معنوں میں ابن اللہ نہیں جن معنوں میں بنی نوع انسان خدا کے بیٹے ہیں۔ انجیل جلیل میں الفاظ" خدا کے بیٹے " مستعمل ہوئے ہیں۔ مثلاً صلح کرانے والے" خدا کے بیٹے کہلائینگے" (متی ۹: ۵) عامتہ الناس میں سے دشمنوں کے ساتھ محبت کرنے والے خدا کے " بیٹے" ٹھہرینگے (متی ۵: ۴۵)پس ظاہر ہے کہ خدا کے بیٹے وہ ہیں جو الہیٰ رضا کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالتے ہیں اور اپنے خیالات جذبات وغیرہ میں خدا کی مانند ہوتے جاتے ہیں۔(متی ۵: ۴۵)۔

لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ جہاں انجیل کی تعلیم کے مطابق عامتہ الناس " خدا کے بیٹے " ہوجاتے ہیں ۔وہاں سیدنا مسیح کی بابت انجیل میں اس قسم کے الفاظ نہیں ملتے۔ بلکہ آپ کی بابت ہم کو یہ تعلیم ملتی ہے کہ آپ ابن اللہ ہیں۔ ابنیت کا یہ رشتہ ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں بنی نوع انسان خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ رشتہ خاص طور سے صرف آپ کی ذات سے تعلق رکھتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ منجی جہان اس خطاب کو اپنی ذات خاص کے لئے استعمال فرماتے ہیں۔ انجیل چہارم میں تو یہ بات واضح کردی گئی ہے (۱۳: ۳، ۳۱، ۳۲- ۱۶: ۲۷، ۲۸- ۴: ۳۴- ۳: ۳۵- ۵: ۲۳، ۲۶، ۷: ۲۹- ۸: ۱۹، ۵۸- ۱۰: ۱۵، ۳۰، ۳۸- ۱۱: ۴، ۲۵- ۱۲: ۴۵- ۱۴: ۶- ۱۴: ۱۷: ۵، ۲۱وغیرہ) لیکن اناجیل ثلاثہ میں بھی یہ امر صاف ظاہر ہے مثلاً (متی ۱۱: ۲۷- ۱۹: ۲۸- ۲۸: ۱۹)(مرقس ۸: ۳۸- ۱۲: ۶-۱۳: ۳۲- ۱۴: ۳۶- لوقا ۲۳: ۳۴، ۴۶وغیرہ)۔ مشہور نقاد ڈیلمین (Dolman) کہتاہے کہ " اناجیل ثلاثہ میں کہیں بھی سیدنا مسیح اپنے لئے خطاب " ابن" کا ایسے طور پراستعمال نہیں کرتے جس سے یہ خیال بھی پیدا ہوسکے کہ یہ خطاب خدا کےساتھ محض ایک اخلاقی اور مذہبی رشتہ کو ظاہر کرتاہے۔ یا کوئی ایسا تعلق ظاہر کرتاہے کہ دوسروں کو بھی حاصل ہے یا دوسرے بھی حاصل کرسکتے[94]۔ یہ خطاب کسی تصور کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ایک صریح حقیقت کا انکشاف کرتاہے[95]۔

---

[94] Dalman, Words of Jesus .p.287.
[95] Mackintosh, Persons of Jesus Christ.(T.&T. Clark).p.28

نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را
برتر از عالم وآدم پر عالی نسبی

ڈاکٹر میکن ٹوش (Dr.Mackintosh) متی ۱۱: ۲۷ کی تفسیر میں کہتاہے کہ " سیدنا مسیح کا اور باپ (پروردگار) کا باہمی رشتہ ایسا ہے جس میں کسی اور کا حصہ نہیں کیونکہ بنی نوع انسان میں سے جو اسکے وسیلے خدا کے بیٹے بن گئے ہیں کوئی شخص بھی ابنیت کا وہ رشتہ حاصل نہیں کرسکتا جو اس کو حاصل ہے۔ خدا اور اس کے بیٹے کا رشتہ انسانی عقل سے بلند وبالا ہے اور اس رشتہ میں باپ اور بیٹے کی کامل رفاقت ہے یہ محض ایک نیا تصور ہی نہیں بلکہ یہ نیا تصور ایک نئی حقیقت کو ظاہر کرتاہے[96]۔ اسی طرح ڈاکٹر سینڈے (Dr.Sanday) کہتا ہے کہ " اگرہم اصول وروایت وعلم کے مطابق اناجیل کا مطالعہ کریں تو یہ امر بدیہی طور پر ظاہر ہوجاتاہے کہ سیدنا مسیح کی اپنی نظر میں ابنیت کے احساس کا مطلب ایسا ٹھہرا ۔ صاف اور کامل تھا جو کسی اور شخص کو نصیب نہیں ہوسکتا تھا[97]۔ ہم نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ " ابوت کا الہٰی مفہوم لکھاہے اور ناظرین کی توجہ اس کی طرف مبذول کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

[96] H.R.Mackintosh, Art.Person of Christ in Hasting's One Vol.Dictianary of the Bible .p.703.
[97] Sanday, Hasting's Dictionary of the Bible Vol.4.p.5.5

(۲)

عبدِ یہوواہ: یعنی خداوند کا خادم۔

منجئی عالمین کی آمد کے وقت اہلِ یہود کے قومی حالات بہت کچھ اس زمانہ جیسے تھے جس میں یسعیاہ کی کتاب کا دوسرا حصہ (ابواب ۴۰تا آخر) لکھا گیا تھا اور عبد یہوواہ کا تصور صورت اختیار کررہا تھا(یسعیاہ ۴۱: ۸تا ۲۰۔ ۴۲: ۱، ۷، ۱۸۔ ۴۳: ۵۔ ۱۰۔ ۴۹: ۱۔۹۔ ۵۰: ۴تا ۱۰۔ ۵۲: ۱۳تا ۵۳: ۱۲۔ ۶۱: ۱تا ۳ وغیرہ) قوم یہود مشرکین کی غلام تھی اوراسرائیل کی راستبازی اور نجات کے سیاسی اورمذہبی سوالات لوگوں کے اذہان میں پھر حباب کے خواہاں تھے یروشلیم کی ہیکل میں اور ارضِ مقدس کے دور افتادہ گوشوں میں شریعت اورصحف انبیاء کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ چاروں طرف لوگ مسیح موعود کے منتظر تھے۔(لوقا ۳: ۱۵) اور شمعون جیسے اسرائیلی کی تسلی کے منتظر تھے(لوقا ۲: ۲۵) یہ "تسلی " وہی تھی جس کا ذکر یسعیاہ کی کتاب کے دوسرے حصہ کی ابتدا میں ملتا ہے" خداوند فرماتاہے کہ تم میرے لوگوں کو تسلی دو۔ تسلی دو۔ "اسے پکار کے کہو کہ" اس کی مصیبت کے دن گذر گئے"(۴۰: ۱تا ۲) پس جب سیدنا مسیح اس دنیا میں معبوث ہو کر آئے لوگوں کے ذہن اسرائیل کی رہائی اور نجات کے خیالات کی طرف متوجہ تھے۔

اوروہ ایک " عبد یہوواہ" کی انتظار میں تھے جس کی پیش خبری مذکورہ بالا کتاب میں موجود تھی۔

منجئی کونین نے اپنے آپ کو عبدیہوواہ کے تصور کا مصداق قرار دیا۔آپ نے اپنی خدمت کی ابتدامیں عبادت خانہ میں عبد یہواہ کے ایک مقام کا اقتباس کیا۔(لوقا ۴: ۱۸تا ۱۹)اور اپنی زبانِ حقائق ترجمان سے فرمایا"۔ آج یہ نوشتہ تمہارے سامنے پورا ہواہے"(لوقا ۴: ۲۳) بپتسمہ کے وقت جو الہیٰ آواز آپ کو سنائی دی وہ اسی تصور کی صدائے بازگشت تھی (یسعیاہ ۴۲: ۱۔ متی ۳: ۱۷) منجئی جہان نے اپنے آخری ایام میں خدمت کے کام پر زوردیا اور عملی نمونہ دے کر(یوحنا ۱۳: ۱تا ۶)آپ نے فرمایا" ابن آدم اس لئے آیا ہے کہ خدمت کرے اور اپنی جان بہتیروں کے بدلے فدیے میں دے"(متی ۱۰: ۴۵مقابلہ کرویسعیاہ ۵۲: ۱۳تا ۵۳: ۱۲) اپنی زندگی کی آخری رات سیدنا مسیح نے شاگردوں کوصاف طورپر فرمایا کہ عبدیہواوہ میں ہی ہوں (لوقا ۲۲: ۲۲، ۲۷، ۳۷)۔

کلمتہ اللہ کی لاثانی بصیرت نے مذہبی تجربہ او رمعرفت کی بنا پر دوسرے زبور کے مسیح موعود کے تصور کو اور یسعیاہ کے عبدیہواوہ کے تصور کو یکجا کرکے ان دونو تصورات کا اطلاق اپنے اوپر کیا۔ عبدیہواوہ کے تصور کا یہ مطلب ہے کہ اس خادم کی حالت کی تبدیلی اقوام عالم کے لئے مکاشفہ کا باعث ہوگی ۔ لیکن وہ مکاشفہ کس شے کا ہوگا؟ منجئی عالمین نے اس عقدہ کا یہ حل فرمایا کہ مکاشفہ اس حقیقت کا ہوگا کہ عبد یہوواہ کے دکھ اور مصائب اپنے گناہوں کی وجہ سے نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے تھے۔ اقوامِ عالم عبد یہوواہ پر نگاہ کرکے کہینگی کہ" یقیناً اس نے ہماری مشقتیں اٹھالیں اورہمارے غموں کا بوجھ اپنے اوپر چڑھایا۔ پرہم نے اس کا یہ سمجھا کہ وہ خدا کا مارا کوٹا اور ستایا ہوا ہے پروہ ہمارے گناہوں کے سبب گھائل کیا گیا اور ہماری بدکاریوں کے باعث کچلا گیا۔ ہماری ہی سلامتی کے لئے اس پر سیاست ہوئی تاکہ اس کے مارکھانے سے ہم چنگے ہوں۔ ہم سب بھیڑوں کی مانند بھٹک گئے۔ہم میں سے ہر ایک اپنی راہ کو پھرا۔ پرخداوند نے ہم سبھوں کی بدکاری اس پرلادی۔ وہ تو نہایت ستایا گیا اور غمزدہ ہوا۔ توبھی اس نے اپنا منہ نہ کھولاوہ جیسے برہ جسے ذبح کرنے لے جاتے اورجیسے بھیڑ اپنے بال کترنے والوں کے آگے بے زبان ہے اسی طرح اس نے اپنا منہ نہ کھولا۔ایذادے کے اوراس پر حکم کرکے وہ اسے لے گئے پر کون اس کے زمانے کا بیان کریگا؟ کہ وہ زندوں کی زمین سے کاٹ ڈالا گیا۔ میری گروہ کے گناہوں کے سبب اس پرمار پڑی اس کی قبر بھی شریروں کے درمیان ٹھہرائی گئی تھی۔ پر وہ اپنے مرنے کے بعد دولتمندوں کے ساتھ ہوا کیونکہ اس نے کسی طرح کا ظلم نہ کیا اوراس کے منہ میں ہرگز چھل نہ تھا"(یسعیاہ ۵۳: ۴تا ۹)۔

کلمتہ اللہ کی زبان معجز بیان نے فرمایا تھا کہ " ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ خدمت کرے اوراپنی جان بہتوں کے فدیہ میں دے"

(متی ۲۰: ۲۸) سیدنا مسیح کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی بادشاہت میں صرف خدمت ہی حقیقی عظمت کا معیار ہے۔ یہ معیار آپ نے عبد یہوواہ کے تصور سے اخذ کیا تھا۔ آپ نے اس معیار کا اطلاق نہ صرف بادشاہت کے ممبروں پر کیا بلکہ اپنے اوپر بھی کیا کیونکہ آپ خود عبد یہوواہ تھے۔ اوراس بادشاہت کو قائم کرنے آئے تھے۔ آپ کے خیال میں آپ کی خدمت کا معراج آپ کی صلیبی موت تھی جواقوام عالم کو خدا کی بادشاہت میں داخل کرنے کا وسیلہ ہوگی۔ یہ خیالات سیدنا مسیح نے درحقیقت یسعیاہ نبی کے صحیفہ سے عبد یہوواہ کے تصور سے اخذ کئے تھے۔ آپ کے خیال میں آپ کی مبارک موت الہیٰ منشا کی تکمیل تھی۔ اوریہی تعلیم آپ نے حواریوں کو دی اور فرمایا کہ " جب تک گیہوں کا دانہ زمین میں گرکے مر نہیں جاتا اکیلا رہتاہے ۔ لیکن جب مرجاتا ہے توبہت سا پھل لاتاہے۔ جو اپنی جان کو عزیز رکھتاہے وہ اسے کھودیتا ہے اورجو دنیا میں اپنی جان سے عداوت رکھتاہے وہ اسے ہمیشہ کی زندگی کے لئے محفوظ رکھیگا"(یوحنا ۱۲ : ۲۴تا ۲۵)۔

صلیب کی روشنی نے دنیا کے تاریک پہلو کو منور کرکے دکھ اور مصیبت کے مسئلہ لائنیحل کو حل کردیا ہے کلمۃ اللہ نے عبد یہوواہ کے تصور پر غور کرکے ہم کو یہ سکھایا ہے کہ ہم دکھ اور رنج موجب عذاب نہیں۔ نہ تو دکھ اور مصیبت ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہے اور نہ وہ قہر الہیٰ کا نشان ہے۔ بلکہ رنج اور مصیبت اس لئے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ " خدا کے کام" ظاہر ہوں(یوحنا ۹ : ۲تا ۳) پس مصیبت جو ہم پر آتی ہے ۔ موجب عذاب نہیں بلکہ موجب ثواب ہے۔ آپ نے یہ تعلیم دی رنج اور غم میں ہی حقیقی خوش حالی اور راحت پنہاں ہے۔ زندگی کا راز موت میں پنہاں ہے۔(یوحنا ۱۲ : ۲۴تا ۲۵)۔

کسے بہ زمرہ ارباب دل ندارد راہ
کہ تحفہ زنسیم بلانے آرد

کلمۃ اللہ جو " جلال کا بادشاہ" تھا۔ وہ " مردغم ناک اور رنج سے آشنا" بھی تھا۔ اس کی دنیاوی زندگی کا خاتمہ صلیب پر ہوا اور اس صلیبی موت میں سے ہمیشہ کی زندگی کے چشمے جاری ہوگئے (یوحنا ۴: ۱۴) کلمۃ اللہ کے سوا کسی پیشوائے دین یافلاسفر نے دکھ اور رنج کے مسئلہ کو حل نہ کیا۔ ڈین انج (Deaningz) کہتاہے کہ " بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتاہے کہ یونانی فلاسفہ دکھ کے مسئلہ کو چھونے سے ڈرتے ہیں درحقیقت مسیحیت کے سوا کسی فلسفہ یا مذہب نے غم کے ڈنگ کو نہیں نکالا"[98]۔

اہل یہود نے یسعیاہ نبی کے صحیفہ اور خروج ۳۲: ۳۲ کو اپنی پُر مصیبت تاریخ کی روشنی میں پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا تھا کہ خدا ان شہیدوں کی شفاعت منظور کرتاہے جنہوں نے اس کی خاطر اپنی جان قربان کردی تھی ۔ ارامی تارگم یسعیاہ نبی کے مذکورہ بالا الفاظ کا اطلاق مسیح موعود پر کرکے یوں

[98] Inge. Philosophy of Plotinus vol.2.p.208 See also Bigg. Christian Platonists. P.238.

حاشیہ آرائی کرتاہے " دیکھو میرا خادم مسیح خوشحال ہوگا۔ وہ ہمارے گناہوں کے لئے دعا کریگا اور اس کی خاطر ہماری بد کرداریاں معاف کی جائینگی۔ ہم سب بھیڑوں کی طرح تتر بتر ہوگئے تھے ہم میں سے ہر ایک اپنی راہ سے بھٹک گیا تھا۔ لیکن خداوند کی یہ مرضی ہوئی کہ وہ ہم سبھوں کے گناہ اس کی خاطر معاف کرے۔ اس نے دعا کی اور وہ قبول ہوگئی۔ اس کے لب کھلنے سے پہلے ہی وہ مقبول ہوگیا۔ وہ بہتوں کے گناہوں کے لئے شفاعت کرے گا۔ اور باغی اس کی خاطر معاف کئے جائیں گے[99]۔ یہ الفاظ عید فسح کے موقعہ پر یہودی عبادت خانوں میں پڑھے جاتے تھے۔ منجئی عالمین نے ان کو بہتیری دفعہ سنا تھا اور یہ الفاظ اپنے اوپر چسپاں کئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ منجئی جہان نے آخری فسح پر عشائے ربانی کی رسم مقرر کرتے وقت فرمایا " یہ نئے عہد کا میرا وہ خون ہے جو بہتیروں کے لئے گناہوں کی معافی کے واسطے بہایا جاتاہے"۔ جس سے صاف ظاہر ہوتاہے۔ کہ یہ سید الشہدا سیدنا مسیح کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے پیروؤں کی شفاعت کرے گا۔ پس ظاہر ہے کہ خود سیدنا مسیح نے عبد یہوواہ کے تصور پر غور کرکے اس تصور کا اطلاق اپنی زندگی اور موت پر کیا تھا۔ منجئی کونین اپنے آپ کو عبد یہواہ خیال کرتے تھے۔

یسعیاہ نبی کے صحیفہ کے مطابق عبد یہوواہ کے ذریعہ اقوام عالم خدا کی طرف رجوع کریں گی " وہ اقوام عالم کے درمیان عدالت وانصاف کا اعلان کرے گا۔ خداوند نے تجھے صداقت کے لئے بلایا اور لوگوں کو عہد اور قوموں کے نور کے لئے تجھے دوں گا"(یسعیاہ ۴۲: ۱ تا ۶)۔ اسی تصور کی روشنی میں کلمۃ اللہ نے اپنی موت کو خوشی سے قبول کیا۔ کیونکہ ابن اللہ خدا کی طرف سے ایک بخشش تھے جو بنی نوع انسان کو عطا کئے گئے تھے۔ آپ کی موت ایک قربانی تھی جو اقوام عالم کے گنہگاروں کو خدا کے پاس لانے کا ذریعہ تھی۔(یوحنا ۱: ۲۹، ۳۵۔ ۳: ۱۶)۔ آپ نے فرمایا کہ آپ کی زندگی اور موت کا مقصد ہی یہ ہے کہ اقوام عالم خدا کی طرف رجوع کریں۔ آپ کی زبانِ فیض ترجمان نے فرمایا" ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ خدمت کرے اور اپنی جان بہتوں کے بدلے فدیہ میں دے " (متی ۲۰: ۲۸) جب موت نزدیک آئی توآپ نے فرمایا" میں اسی سبب سے تو اس گھڑی کو پہنچا ہوں۔ اے باپ اپنے نام کو جلال دے "(یوحنا ۱۲: ۲۷تا ۲۸) آپ کا یہ پختہ یقین تھا کہ آپ کے دکھ اور تکلیف اور آپ کی موت کی وجہ سے اقوام عالم زندگی حاصل کرینگی۔

(۳)

ابن آدم:

عبد یہوواہ کے تصور کے ساتھ ابن آدم کا خطاب بھی وابستہ ہے یہ خطاب دانی ایل کی کتاب ۷: ۱۳ میں اورحنوک کی کتاب (ابواب ۷۳تا ۷۰) میں ملتاہے۔ حنوک کی کتاب کے یہ ابواب منجئی عالمین کی بعثت سے

[99]Quoted by Bacon, in Jesus and Paul.p.114.

ایک صدی پہلے (غالباً ۹۶ قبل مسیح تا ۶۴ قبل مسیح) لکھے گئے تھے۔ ان میں "ابن آدم" ایک فوق البشر ہستی ہے جو قادر مطلق کے ساتھ تخت پر بیٹھاہے اورعدالت کرتاہے۔ ہمیں واثق یقین ہے کہ کلمۃ اللہ ان تمام تصورات سے بخوبی واقف تھے اورآپ نے " ابن آدم" کا تصور ان کتب سے اور آٹھویں زبور سے اور حزقی ایل (۲: ۱) سے اخذ کیا تھا۔

یہ خطاب اناجیل ثلاثہ میں ۶۹ دفعہ استعمال ہوا ہے۔ انجیل اول میں تیس دفعہ ،انجیل دوم میں ۱۴ مرتبہ اورانجیل سوم میں ۲۵ دفعہ استعمال ہواہے یہ خطاب اناجیل کے ان تمام حصص میں موجود ہے ۔ جن سے اناجیل مرکب ہیں۔اور جن کا ذکر اس رسالہ کے مقدمہ میں کیا گیا تھا اورجن کو ہم نے "ک" سے موسوم کیا تھا[100] ۔ ربنا المسیح نے چالیس مختلف اوقات پر یہ خطاب اپنے لئے استعمال فرمایا۔ ہم کو یہ ایک انوکھی بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ کوئی شخص اپنے لئے واحدِ متکلم کی بجائے واحد غائب کا صیغہ ایک خطاب کے طور پر استعمال کرے۔ لیکن سیدنا مسیح نے اس خطاب کو اپنی ذات خاص کے لئے تجویز فرمایا اوراناجیل میں سوائے کلمۃ اللہ کے کوئی دوسرا شخص اس خطاب کوآپ کے لئے استعمال نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ مقدس پولوس رسول بھی اس خطاب کو کبھی استعمال نہیں کرتا اوراناجیل اربعہ کے علاوہ عہدِجدید میں سوائے ایک جگہ کے (اعمال ۷: ۵۶) اس خطاب کا ذکر نہیں ملتا۔

[100] Dr. Atmitage Robinson. The Study of the Gospels p.49.

بعض علماء کا خیال ہے ۔ کہ یہ خطاب کلمۃ اللہ نے پہلی دفعہ قیصریہ فلپی میں استعمال کیا تھا۔جب آپ نے شاگردوں سے استفسار فرمایا تھا کہ " لوگ ابن آدم کو کیاکہتے ہیں "؟(متی ۱۶: ۱۳) کیونکہ اس خطاب سے مراد مسیح موعود تھا اورآپ نہیں چاہتے تھے کہ اس موقع سے پہلے کسی کو معلوم ہو کہ آپ مسیح موعود ہیں بلکہ اس موقعہ پر بھی آپ نے " شاگردوں کو تاکید کرکے حکم دیا کہ کسی کو نہ بتانا کہ یہ مسیح ہے"(متی ۱۶: ۲۰۔لوقا ۹: ۲۱) پس یہ علما کہتے ہیں کہ وہ تمام مقامات جن میں اس واقعہ سے پہلے " ابن آدم " کا ذکر ہے"۔ یا تو درحقیقت اس واقعہ کے بعد وقوع پذیر ہوئے اوریا ان میں سے بعض ایسے ہیں۔ جن میں " ابن آدم" سے مراد درحقیقت بنی آدم یا انسان ہے لیکن مرحوم کینن ڈرائیور (Canon Driver) نے اس اعتراض کا پول کھول دیا ہے[101] ۔ اور بالعموم علماء ان کے ساتھ متفق ہیں[102] ۔ اگر سیدنا مسیح نے اس موقعہ پر پہلی دفعہ یہ خطاب استعمال فرمایا تو شاگردوں نے کوئی حیرت یا استعجاب کیوں نہ ظاہر کیا؟ خود کلمۃ اللہ کا سوال اس بات کو ظاہر کرتاہے کہ انہوں نے اس خطاب کوآپ کی زبان مبارک سے کئی دفعہ اس موقعہ سے پہلے سنا تھا ۔ اور وہ اس سے واقف تھے۔کیونکہ انہوں نے سیدنا مسیح سے یہ نہیں پوچھا کہ " ابن آدم" جس کی نسبت آپ پوچھتے ہیں کون ہے؟ بالفرض اگر

[101] Hasting's Dictionary of the Bible .vol.4.Art.Son of Man.pp.580-582
[102] *e.g.* Sanday in Dictionary of the Bible Vol.2.pp.622-623

سیدنا مسیح کے سوال میں یہ خطاب موجود نہ تھا (مرقس ۸: ۲۷-۳۰۔ لوقا ۹: ۱۸) تاہم سیدنا مسیح نے اس سوال کے بعد ہی یہ خطاب اپنے لئے استعمال فرمایا۔(مرقس ۸: ۳۱-لوقا ۹: ۲۲) یہ دلیل اس بات کو صاف ظاہر کرتی ہے کہ سیدنا مسیح نے اس واقعہ سے پہلے کئی دفعہ یہ خطاب علے اعلان اپنے لئے استعمال فرمایا تھا اور اگر یہ صحیح ہے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عوام الناس کے اذہان میں اس خطاب کا تعلق مسیح موعود کے تصور کے ساتھ وابستہ نہ تھا[103] (یوحنا ۱۲: ۳۴) کیونکہ سیدنا مسیح نہیں چاہتے تھے کہ ہنوز یہ حقیقت لوگوں پر ظاہر ہو کہ آپ مسیح موعود ہیں۔

لفظ" ابن آدم" ارآمی زبان میں نوع انسان کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا-ارآمی زبان میں یہ کوئی خطاب نہ تھا۔ لیکن کلمۃ اللہ نے اس ایک معمولی لفظ کو لے کر اس کو اپنی ذات خاص کے لئے تجویز فرمایا۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ کے ذہن مبارک میں اس لفظ کے ساتھ چند ایسی صفات وابستہ تھیں ۔ جو آپ کی ذات والاصفات میں بدرجہ احسن پائی جاتی تھیں اور جن کا تعلق آپ کے اس مشن کے تھا۔ جس کے لئے خدا نے آپ کو اس دنیا میں بھیجا تھا۔ آپ اس جہان میں دکھ تکلیف اذیت بلکہ صلیب اٹھانے آئے تھے۔ پس جو نہی حواریوں نے کلمۃ اللہ کی مسیحائی کا اقرار کیا وہ " انہیں تعلیم دینے لگا"۔ کہ ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دکھ اٹھائے اور امام اعظم اور فقیہ اسے رد کریں اور وہ قتل کیا جائے (مرقس ۸: ۳۱) پس کلمۃ اللہ نے " ابن آدم " کے تصور کے ساتھ " عبد یہوواہ کا تصور وابستہ کرکے دونوں تصورات کا اطلاق اپنی مبارک ذات پر کیا آپ نے "ابن آدم " کے خطاب کو اسی واسطے فرمایا کیونکہ اس خطاب میں تکلیف اور جلال ، مصیبت اور فتح کے تصور بآسانی شامل کئے جاسکتے تھے۔ اہل یہود کی کتب اور فتح کے تصور بآسانی شامل کئے جاسکتے تھے۔ اہل یہود کی کتب کے مطابق" ابن آدم" ایک فوق البشر انسان تھا۔ جو قادرِ مطلق کے ساتھ جلال کے تحت پر بیٹھ کر عدالت کریگا۔لیکن دانی ایل کی کتاب کے مصنف نے یہ کہیں نہیں کہا تھا کہ اس پر جلال آمد سے پہلے "ابن آدم" دکھ اور تکلیف نہیں اٹھائیگا۔ پس کلمۃ اللہ نے اس خطاب کے ساتھ دکھ اور مصیبت اور تکلیف کی برداشت متعلق کردی اور اس کا اطلاق اپنی ذات پر کیا-اب یہ معلوم ہوگیا کہ آپ کا خیال تھا کہ آپ خود وہ" ابن آدم" ہیں جس کا ذکر دانی کی کتاب میں ملتا ہے لیکن آپ کا یہ بھی خیال تھا کہ اس سے پہلے کہ اس صحیفہ کی باتیں پوری ہوں۔ آپ کی پہلی آمد کے زمانہ میں " ابن آدم" کو عبد یہوواہ کے تصور کے مطابق دکھ سہنا اور لوگوں کی خاطر اپنی جان کو قربان کرنا ضرور ہے۔ اس پہلی آمد کا ذکر دانی ایل نبی نے نہیں کیا تھا۔ بلکہ یہ نیا مکاشفہ ہے جو سیدنا مسیح کی زبانِ حقیقت ترجمان نے پہلی دفعہ دنیا پر ظاہر کیا۔

اگر ہم ان چالیس مقامات پر ایک سطحی نظر ڈالیں جہاں کلمۃ اللہ نے خطاب" ابن آدم" اپنے لئے استعمال فرمایا ہے تو ہم کو معلوم ہوجائیگا کہ یہ

[103] See Box. in the People and the Book.p.453.

مقامات دوحصوں پر منقسم ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے مقامات وہ ہیں جن میں سیدنا مسیح اس دکھ اور مصیبت اور اذیت کا ذکر کرتے ہیں جو " ابن آدم" کو برداشت کرنی ہوگی۔ دوسری قسم کے مقامات وہ ہیں ۔ جن کا تعلق سیدنا مسیح کی پُرجلال آمد ثانی کے ساتھ ہے۔ پس ثابت ہوگیا کہ کلمۃ اللہ کا یہ خیال تھا کہ آپ خود بنفسِ نفیس " ابن آدم" ہیں کہ آپ پہلے " عبد یہوواہ" کی طرح دکھ اور صلیبی موت کے ذریعہ فتحیاب ہونگے۔ اور پھر جلال کے ساتھ واپس دوبارہ عدالت کے لئے تشریف لائینگے۔ جس طرح یہودی کتب میں " ابن آدم" کی بابت لکھاہے۔ جومقدس پطرس رسول نےآپ کے مسیحائی کا اقرار کیاآپ نے بار بار تاکید کرکے ان پر یہ جتایا کہ " ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دکھ اٹھائے اور قتل کیا جائے۔ اور تین دن کے بعد جی اٹھے"(مرقس: ۸: ۳۱)۔ پس یسعیاہ کی کتاب کے " عبدیہوواہ" کی طرح دکھ اٹھانا اوردانی ایل کی کتاب کے " ابن آدم" کی طرح جلال میں ہونا یہ دوعنصر تھے۔جو کلمۃ اللہ نے " ابن آدم" کے مفہوم میں داخل کئے۔ ایک طرف توآپ نے فرمایا کہ" لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے مگر ابن آدم کے لئے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں"(متی ۸: ۲۰)اور دوسری طرف ارشاد فرمایاکہ" ابن آدم کو زمین پر گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار ہے"(متی ۹: ۶) حواریوں کو ایک طرف آپ نے فرمایاکہ " ضرور ہے کہ ابن آدم قتل کیا جائے"(متی ۱۶ : ۲۳۔ لوقا ۹: ۲۲)اور دوسری طرف یہ فرمایا کہ" ابن آدم اپنے باپ کے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ آئیگا اس وقت ہر ایک کو اس کے کاموں کے موافق بدلہ دیگا۔(متی ۱۶: ۲۷۔ یوحنا ۵: ۲۷)۔ پھر فرمایا" اقوام عالم ابن آدم کو بڑی قدرت اور جلال کے ساتھ آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھینگی"(متی ۲۴: ۳۰) اور سردار کاہن کو فرمایا" تم ابن آدم کو قادرِ مطلق کی دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھوگے(مرقس ۱۴: ۶۲)۔

پس کلمۃ اللہ کے خیال کے مطابق " ابن آدم" کی ذات میں صلیبی موت کا پہلو اورالہیٰ جلال کا پہلو دونوں شامل تھے۔ لفظ" ابن آدم" ارامی زبان میں کوئی خطاب نہ تھا اوراسی واسطے چنا گیا تھا کہ اس سے کسی خطاب کی بُو بھی نہ ٹپکتی تھی۔ لیکن سیدنا مسیح نے اس معمولی ارامی لفظ کو لیا اوراس میں اپنی زندگی ،صلیبی موت، فتحیاب قیامت اور ظفریاب آمد کا مفہوم بھر کے اس کو ایک اعلیٰ تریں خطاب بنادیا اور دریا کو کوزہ میں بند کردیا ۔" اس ایک تصور سے ہم ابن اللہ کی جدت کی گہرائی اور اونچائی کا اندازہ لگاسکتے ہیں[104]۔

(۴)

ادعائے مسیح:

ہم نے ان خطابات پر جو اناجیل میں ربنا المسیح کے لئے مستعمل ہوئے ہیں ایک تفصیلی نگاہ ڈالی ہے تاکہ معلوم کریں کہ آپ کو اپنی ذات کی

[104] Munrhead, Eschatology of Jesus .p.203

نسبت کا احساس تھا۔ اسی شمولیت میں اب ہم ان ادعا اور کلمات پر نظر کرینگے جو سیدنا مسیح کی زبان حقیقت ترجمان سے صادر ہوئے ہیں۔ اور اناجیل ثلاثہ میں مذکور ہیں تاکہ معلوم ہو کہ آپ کا اپنا خیال آپ کی ذات والاصفات کی نسبت کیا تھا۔ اختصار کی خاطر ہم صرف چند آیات پر ہی اکتفا کرینگے:

(۱) اس دن بہتیرے مجھ سے کہینگے اے مولا۔ اے مولا کیا ہم نے آپ کے نام سے نبوت نہیں کی اور آپ کے نام سے بدروحوں کو نہیں نکالا۔ اس وقت میں ان سے صاف کہہ دونگا کہ میری کبھی تم سے واقفیت نہ تھی۔ اے بدکارو میرے پاس سے چلے جاؤ (متی ۷ ا: ۱۲)۔

(۲۔) ابنِ آدم کو زمین پر گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار ہے (متی ۹: ۶)۔

(۳۔) جو کوئی آدمیوں کے سامنے میرا اقرار کرے گا۔ میں بھی اپنے باپ کے سامنے جو آسمان پر ہے۔ اسکا اقرار کروں گا جو کوئی آدمیوں کے سامنے انکار کریگا۔ میں بھی اپنے باپ کے سامنے جو آسمان پر ہے۔ اس کا انکار کروں گا" (متی ۱۰: ۳۲تا۳۳)۔

(۴۔) جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔۔۔۔ جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا" (متی ۱۰: ۳۷تا ۳۹)۔

(۵۔) میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا ہے۔ اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوائے باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوائے بیٹے کے اور اس کے جس پر بیٹا ظاہر کرنا چاہیے (متی ۱۳: ۴۱)۔

(۶۔) ابنِ آدم اپنے فرشتوں کو بھیجیگا (متی ۱۳: ۴۱)۔

(۷۔) ابنِ آدم اپنے باپ کے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ آئے گا۔اس وقت ہر ایک ۔۔۔۔۔ کو اس کے کاموں کے موافق بدلہ دے گا"۔(متی ۱۶: ۲۷)۔

(۸۔) جہاں دو یا تین میرے نام پر اکٹھے ہوں۔ وہاں میں ان کے بیچ میں ہوں (متی ۱۸: ۲۰)۔

(۹۔) ابنِ آدم اس لئے آیا کہ اپنی بہتیروں کے بدلے فدیہ میں دے (متی ۲۰: ۲۸)۔

(۱۰۔) داؤد اس کو مولا کہتا ہے (متی ۲۲: ۴۵)۔

(۱۱۔) دیکھو میں دنیا کے آخر تک ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں (متی ۲۸: ۲۰)۔

(۱۲۔) میں تم کو ایسی زبان اور حکمت دونگا کہ تمہارا کوئی مخالف سامنا کرنے یا خلاف کہنے کا مقدور نہ رکھیگا۔(لوقا ۲۱: ۱۵)۔

(۱۳۔) دیکھو جس کا میرے باپ نے وعدہ کیا ہے میں اس کو تم پر نازل کرونگا (لوقا ۲۴: ۴۹)۔

(۱۴) تم ابن آدم کو قادرِ مطلق کی دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھوگے۔(متی ۲۶: ۶۴)۔

اختصار کی خاطر ہم نے صرف چند آیات پر ہی کفایت کی ہے بخوف طوالت ہم ان میں سے صرف ایک آیت کو مختصر طور پر تشریح کرینگے۔ یہودی خیالات کے مطابق صرف خدا تعالیٰ ہی " بادلوں" پر سوار ہوسکتا تھا(زبور ۱۰۴: ۳) پس آخری آیت کا یہ مطلب ہوا کہ کلمۃ اللہ کے خاص حقوق اپنے اختیار میں رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب یہ الفاظ امام اعظم نے سیدنا مسیح کی زبان سے سنے تو اس نے اپنے کپڑے پھاڑے اور کہا " اس نے کفر بکا ہے۔ دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سنا ہے"(متی ۲۶: ۶۵)۔

اہلِ یہود کے خیالات کے مطابق خدا کی دانش سلیمان میں مجسم ہوئی تھی۔ چنانچہ کتاب" سلیمان کی دانش" ۶: ۲۲ میں لکھا ہے" ۔ دانش کیا ہے اور وہ کس طرح وجود میں آئی ۔ اس کا حال میں تم کو بتاتا ہوں (اس کے بعد سلیمان کی پیدائش کا حال لکھا ہے) میں (یعنی سلیمان) اپنی ماں کے رحم میں گوشت بنا وغیرہ" جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دانش نے سلیمان کی صورت میں مجسم ہو کر اس دنیا میں وجود اختیار کرلیا۔ یہ خیال اہلِ یہود میں عام طور پر رائج تھا ۔ پس انجیل اول میں سیدنا مسیح کا وہ قول نہایت معنی خیز ہے کہ" دکھن کی ملکہ اس زمانے کے لوگوں کے ساتھ عدالت کے دن اٹھ کر انہیں مجرم ٹھہرائیگی۔ کیونکہ وہ دنیا کے کنارے سے سلیمان کی حکمت سننے کو آئی اور دیکھو یہاں وہ ہے جو سلیمان سے بھی بڑا ہے"(متی ۱۲: ۴۲) کلمۃ اللہ کے سامعین سمجھے کہ دکھن کی ملکہ اس حکمت کو سننے آئی جو سلیمان میں مجسم تھی اور دیکھو اس جگہ خدا کی دانش کا افضل اور کامل اوتار اور بہترین مظہر کھڑا ہے ۔ جس کے مقابلہ میں دانش مجسم سلیمان ایک ناچیز انسان تھا۔

بن سیرخ کی کتاب اکلی زیاسٹیکس میں دانش خطاب کرکے کہتی ہے کہ جاہلو تم میں پاس آؤ اور تعلیم کے گھر میں رہائش اختیار کرو اپنی گردن دانش کے جوئے تلے کرو اور اس سے سیکھو اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ میں نے تھوڑی ہی محنت اٹھائی اور مجھے کتنا آرام ملا ہے تم دانش کے پاس آؤ تو تمہاری جانیں آرام پائینگی۔ لیکن کلمۃ اللہ جب ان الفاظ کو دہراتے ہیں تو آپ یہ نہیں فرماتے کہ تم الہیٰ دانش کے پاس آؤ تو تم آرام پاؤ گے بلکہ فرماتے ہیں کہ " تم میرے پاس آؤ میں تم کو آرام دونگا"۔ پھر آپ یہ نہیں فرماتے کہ تم الہیٰ دانش کے جوئے تلے اپنی گردنیں کرو اور اس سے سیکھو بلکہ فرماتے ہیں " میرا جوا اپنے اوپر اٹھالو اور مجھ سے دیکھو تو تمہاری جانیں آرام پائینگی "۔(متی ۱۱: ۲۸) پس صاف ثابت ہوتا ہے کہ کلمۃ اللہ اپنے آپ کو مجسم الہیٰ دانش خیال فرماتے تھے۔

ع ذاتِ او عقل مجسم آمد

کلمۃ اللہ کے اقوال میں سے ایک اور قول کا ہم ذکر کرتے ہیں ۔آپ نے فرمایا" ۔جو کوئی آدمیوں کے سامنے میرا اقرار کریگا۔ میں بھی اپنے باپ

کے سامنے جو آسمان پر ہے اس کا اقرار کرونگا۔ جو کوئی آدمیوں کے سامنے میرا انکار کرے گا میں بھی اپنے باپ کے سامنے جو آسمان پر ہے اس کا انکار کرونگا"(متی ۱۰: ۳۲تا ۳۳)۔ انسانی الفاظ اس سے زیادہ واضح طور پر اس حقیقت کو بیان نہیں کرسکتے کہ انسان کی آخری قسمت کا فیصلہ ربنا المسیح سے وفاداری کرنے پر منحصر ہے۔ جس شخص کے منہ سے یہ الفاظ نکل سکتے ہیں وہ یہ احساس ضرور رکھتا ہوگا کہ وہ خدا اور انسان کے درمیان ایک ایسا رشتہ رکھتاہے جو کوئی اور شخص نہیں رکھ سکتا۔ کوئی شخص جرات کرکے ایسے الفاظ زبان پر نہیں لاسکتا جب تک اس کو اس بات کا پختہ یقین نہ ہو وہ خدا اور انسان کے درمیان دونوں طرف سے ایک ایسا رشتہ رکھتاہے جو لاثانی بے نظیر اور عدیم المثال ہے۔ خدا ایک ہے اور خدا اور انسانوں کے بیچ میں درمیانی بھی ایک ہے یعنی سیدنا عیسیٰ مسیح جو انسان ہے" (۱۔تمطاؤس ۲: ۵) انبیائے سلف نے کبھی ایسے عظیم دعوے نہیں کئے تھے۔ کسی نبی نے نہیں کہا تھا کہ " جو کوئی آدمیوں کے سامنے میرا اقرار کریگا میں بھی اپنے باپ کے سامنے جو آسمان پر ہے اس کا اقرار کرونگا"۔ کسی نبی کے وہم وگمان میں بھی کبھی نہ آیا تھا کہ کہے" میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا ہے اور کوئی بیٹے کو نہیں جان سکتا سوائے باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوائے بیٹے کے"(متی ۱۱: ۲۷)وہ عظیم الشان ہستیاں یہ یہ اعلان کرنے پر اکتفا کرتی تھیں کہ " خداوند فرماتاہے "۔ وہ لوگوں کو خدا کے پاس آنے کی دعوت دیتے تھے۔ لیکن ربنا المسیح کے خیال میں بہترین اور افضل ترین بات یہ تھی کہ خلقِ خدا آپ کے پاس آئے (متی ۱۲: ۲۸) پس کوئی صحیح العقل شخص آپ کو صرف انبیاء عظام کی صف میں شمار نہیں کرسکتا۔ آپ کے دعوے نہایت عظیم الشان ہیں آپ کے ادعا میں سے تین دعوئے خاص طور پر قابل غور ہیں : اولاً آپ کا دعویٰ کہ آپ دنیا کی عدالت کرینگے "۔(متی ۱٦ ۔ ۲۷۔ یوحنا ۵: ۲۷وغیرہ) ثانیاً آپ کا دعویٰ کہ آپ کو گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار حاصل ہے(متی ۹: ٦) اور ثالثاً کہ آپ زندگی اور موت کے مالک ہیں۔ عہدِ عتیق کی کتب گواہ ہیں کہ انبیائے سلف میں سے کسی نے ایسے دعوے کبھی نہ کئے۔ ان کتب سابقہ سے ظاہر ہے کہ یہ تینوں باتیں خاص خدا کی ذات کے ساتھ وابستہ تھیں۔ خدا دنیا کا بادشاہ ہونے کی حیثیت سے دنیا کی عدالت کرنے کا اور اپنی مخلوق کے گناہ معاف کرنے کا اور ان کی زندگی اور موت کے واحد مالک ہونے کا حق رکھتا تھا۔ لیکن انجیل شریف سے ظاہر ہے کہ منجئی کونین نے تینوں دعوے خود اپنی زبان حقائق ترجمان سے کئے۔ آپ کے خطابات ہمارے دلوں پر اتنا فوری اثر نہیں کرتے جتنا آپ کے ادعا اور کلمات طیبات کرتے ہیں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ آپ کا مرتبہ اور آپ کی شان اس قدر بلند و بالا ہے کہ کوئی خطاب کماحقہ ، آپ کی اعلیٰ اور ارفع ہستی کو ادا نہیں کرسکتا۔ خدا نے آپ کو" بہت سر بلند کیا اور وہ نام بخشا جو سب خطابوں سے اعلیٰ ہے "(فلپیوں ۲: ۹)۔

کیاہم اس کے قدموں میں آکر اوراس پر ایمان لاکر نجات حاصل نہ کریں؟

ع   چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرما؟